ماہنامہ
قلندر شعور
جون ۲۰۲۳ء
زمین ماں ہے
جس کے باطن میں اشیاء ڈائیاں ہیں
سکون زندگی کی سب سے بڑی نعمت ہے
اور رُوح کے عرفان کے بغیر سکون نہیں ملتا

We are Professionally For

Grow Your BUSINESS

"Help you to grow your Business."

Our Services

- Website Development
- Content Writer
- Social Media Manager
- Digital Media Website
- Video Editing
- Graphic Designing
- 3D Animation
- Game Development
- Logo design

Gmail
Sabaibrar9786@gmail.com

Call us :
0313 6495037

زیر سرپرستی

اللہ کے دوست حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی

فری ممبرشِپ

عظیمیہ روحانی لائبریری

جنڈ، اٹک

روحانی علوم کے متلاشی خواتین وحضرات، راہِ سلوک کے مسافر اور روحانی سائنس میں دلچسپی رکھنے والے طلبہ وطالبات کے لئے عظیمی صاحب کی تحریر کردہ اور تصوف کی دیگر کتابیں مطالعہ کے لئے موجود ہیں۔

اوقات: عصر تا مغرب روزانہ

حاجی بازار، جنڈ، اٹک۔ موبائل نمبر: 03009145175

QALANDAR SHAOOR ACADEMY
HYDERABAD - PAKISTAN

قلندر شعور اکیڈمی

مراقبہ ہال حیدرآباد

زیر سرپرستی خانوادہ سلسلہ عظیمیہ

قلندر شعور ہماری رہنمائی کرتا ہے کہ ہم کائناتی تخلیقی فارمولوں کے تحت اپنے اندر روحانی صلاحیتوں کو متحرک کر سکتے ہیں۔

روحانی علوم کے متلاشی، راہِ سلوک کے مسافر اور روحانی سائنس میں دلچسپی رکھنے والے خواتین و حضرات کے لئے خوش خبری

گلشن شہباز، نزد ٹول پلازہ، جامشورو حیدرآباد، 71000 ، پاکستان

فون نمبر: 0331-3615533 ، 0333-2695331

DEFENCE
3D - OPG - CEPH

3 DIMENSIONAL DENTAL IMAGING CBCT SYSTEM

KARACHI

3D

Free software provide with implant library to all consultant for Nerve Tracing. Cephalomatric Tracing, Implant Planing.

Maxillofacial

Implant Planning

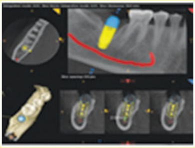

OPG

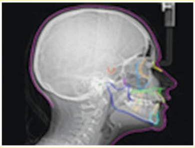

CEPH

Take Your Practice to the Next Level !

Defence branch:
0213-8941506 - 0343-7180348
Building # 7-C, Shop # 1, Street 10, Badar Commercial Area, Phase 5 Ext. DHA, Karachi.

Sharfabad branch:
0213-4920777 - 0320-4690899
Plot # 87, Shop # 2, Zulekha Tower, Block-3, BMCH Society, Main Jamal-ud-Din AfghaniRoad, Sharfabad, Karachi.

Email: info@3d-diagnostic.pk **Web:** www.3d-diagnostic.pk

ONLINE COACHING

From class 9^{th} to BSc

Tania Riaz

Qualification:
BSc in Double Maths & Physics

Experience:
6 Years of experience in Teaching

Subjects to Teach

- Mathematics
- Physics
- Computer

More Info

GMAIL
taniariaz551@gmail.com

Call us
+92 332 8875 840

A GREAT PLACE TO LEARN ONLINE

5^{th} to Msc for all subject

- One paper preparation
- General Knowledge

Enrol Now

More Info

GMAIL
azka.info94@gmail.com

Call us :
+92 300 1208419

جلد 11 شمارہ 5 | جون 2023ء | ذیقعد ــ ذوالحج 1444ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ماہنامہ قلندر شعور کراچی

قلندر شعور

Neutral Thinking

(اردو ـــ انگریزی)

سرپرست اعلیٰ

حضور قلندر بابا اولیاؒ رحمۃ اللہ علیہ

چیف ایڈیٹر

خواجہ شمس الدین عظیمی

ایڈیٹر

حکیم سلام عارف

سرکولیشن منیجر

محمد ایاز

بااہتمام عظیمی یونیورسٹی پریس ـــ پبلشر شاہ عالم عظیمی نے ابن حسن آفسیٹ پرنٹنگ پریس، ہاکی اسٹیڈیم، کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔

فی شمارہ 130 روپے.....سالانہ ہدیہ 1944 روپے رجسٹرڈ ڈاک کے ساتھ، بیرونِ پاکستان 75 امریکی ڈالر سالانہ

B-54، عظیمی محلّہ، سیکٹر 4-C سرجانی ٹاؤن کراچی، پاکستان۔فون نمبر: 6912020 213(0) 92+

۲۹ مضامین کا گُل دان

حمد باری تعالیٰ ______ ڈاکٹر خواجہ عابد نظامیؔ 10

نعت رسول مقبول ﷺ ______ سیّد سلیمانؔ ندوی 11

رباعیات ______ ابدالِ حق حضور قلندر بابا اولیاءؒ 12

آج کی بات ______ مدیر مسئول 14

فقیر کی ڈاک ______ ادارہ 18

نامے میرے نام ______ خانوادہ سلسلہ عظیمیہ 21

آئن اسٹائن کے انتقال کے بعد ______ (M.A.Fine Arts) حامد ابراہیم 25

کہتی ہے یہ مٹی بھی بہت سی باتیں ______ (M.Phil.Supply Chain) بلال حسن 31

پرندے مراقبہ کرتے ہیں ______ ادارہ 37

دریا کی کہانی ______ تیک نات ھان 41

سبق آموز ______ آسیہ روبی 45

بوڑھے طوطے ______ اظہر حسین 51

پریم پیالہ اساں ہنس رس پیتا ______ (M.A.Mass Comm.) قرۃ العین واسطی 57

______ (M.Sc.Botany) خالدہ زبیر 63

لکھنؤ کا دسترخوان ـــــ مرزا جعفر حسین 67

21 کروڑ کلومیٹر ـــــ ڈاکٹر نعیم ظفر (Ph.D.) 75

اپریل 2023ء کے سرورق کی تشریح ـــــ قارئین 80

پہلے مچھر کو ملیریا ہوتا ہے پھر آدمی کو ـــــ خورشید احمد 83

دو چوڑیاں ـــــ عابد محمود 87

اقتباسات ـــــ خواتین و حضرات 93

سنا کِس نے ـــــ عرفانہ شہزاد 95

پورب کے ہم زاد ـــــ محمد عدنان خان (M.Sc. Applied Physics) 101

ٹھنڈا سر ـــ گرم پیر ـــــ محمود فاروقی 109

دنیا عالمِ اسباب ہے ـــــ گلستان احمد 113

آپ کے خواب اور ان کی تعبیر ـــــ عظیمی خواجہ شمس الدین 119

125 Shahzad Amir ـــــ Argument to Agreement

128 Bibi Anuradha (UAE) ـــــ The Mountaineer

135 Quratulain Wasti ـــــ Eternal Presence

138 K. S. Azeemi ـــــ Message of the Day

حمد باری تعالیٰ

ڈاکٹر خواجہ عابد نظامیؔ

ذات ہے اس کی عظیم اور نام رحمٰن و رحیم
لطف ہے اس کا فراواں، فضل ہے اس کا عمیم
اس نے لفظِ کُن سے پیدا کی یہ ساری کائنات
کیا زمیں کیا آسماں کیا بحر کیا عرشِ عظیم
اس کے فیضانِ کرم سے ہے منور آفتاب
لطف سے پائی ہے اس کے غنچہ و گل نے شمیم
وہ چمک دیتا ہے ہر شب انجم و مہتاب کو
وہ چلاتا ہے چمن میں صبح دم بادِ نسیم
وسعتِ کون و مکاں بھی تنگ ہے جس کے لئے
وہ الٰہ العالمیں ہے دل میں بندوں کے مقیم
ایک ہی وہ ذات ہے بس جس کو ہے سجدہ روا
جان سکتی ہے مگر اس بات کو عقلِ سلیم
ہم کو اپنے لطف سے محروم وہ رکھے گا کیوں
جب کہ اس کی ذات ہے منان و وہاب و کریم
مانگتے ہیں سب اسی سے، اس کے سب محتاج ہیں
جھکتے ہیں سب اس کے آگے جاہ و حشمت کے زعیم

نعت رسول مقبول ﷺ

سیّد سلیمانؔ ندوی

عشقِ نبویؐ دردِ معاصی کی دوا ہے
ظلمت کدۂ دہر میں وہ شمعِ ہدیٰ ہے
پڑھتا ہے درود آپ ہی تجھ پر ترا خالق
تصویر پہ خود اپنی مصور بھی فدا ہے
نورِ نبویؐ مقتبس* از نورِ خدا ہے
بندہ کو شرف نسبت مولا سے ملا ہے
احمدؐ سے پتہ ذاتِ احد کا جو ملا ہے
مصنوع* سے صانع کا پتہ سب کو چلا ہے
بندہ کی محبت سے ہے آقاؐ کی محبت
جو پیروِ احمدؐ ہے، وہ محبوبِ خُدا ہے
آمد تری اے ابرِ کرم رونقِ عالَم
تیرے ہی لئے گلشنِ ہستی یہ بنا ہے
فرمانِ دو عالم تری توقیع سے نافذ
تیری ہی شفاعت پہ رحیمی کی بنا ہے
لے جائے گا منزل سے بہت دور بشر کو
جو جادہ* سفر کا ترے جادہ کے سوا ہے

* مقتبس (روشنی لینے والا، فیض یاب) * مصنوع (مخلوق) * جادہ (راستہ)

ذرّوں میں آثار

یہ طاق یہ ٹوٹے ہوئے در اور دیوار
ذرّوں میں نظر آتے ہیں سارے آثار
ذرّوں میں ہے گرم شاعروں کی محفل
ذرّوں میں ہیں بند شاعروں کے اشعار

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

" اور کتنی ہی ایسی بستیاں ہم تباہ کر چکے ہیں جن کے لوگ اپنی معیشت پر اترا گئے تھے۔
سو دیکھ لو، ان کے مسکن پڑے ہوئے ہیں جن میں ان کے بعد کم ہی کوئی بسا ہے، آخر کار
ہم ہی وارث ہیں۔" (القصص: ۵۸)

ابدالِ حق قلندر بابا اولیاؒ فرماتے ہیں کہ دنیا اور دنیا کی رونق، بے ثباتی میں بھی وجودِ بقا کا پہلو رکھتی ہے۔ منفرد فکر اور کمالاتِ انسانی کی لافنائیت کا یہی تصور حضور قلندر باباؒ کی ذات اور احساسات کو عام ذہنوں اور عام تصورات سے بلند و بالا کرتا ہے۔ عظیم الشان محلات، عیش گاہوں کے اجڑے طاق، ٹوٹے در و دیوار سرسری نگاہ سے دیکھنے والوں کے لئے محض روزمرہ کی داستان ہیں کہ دنیا کی ہر شے فانی ہے، ہر شے کی تعمیر میں تخریب اور ہر کمال کا مقدر زوال ہے۔ اس سے زیادہ نہ نگاہیں دیکھ سکتی ہیں اور نہ ذہن اس سے ماورا کوئی اور تصور قائم کر سکتا ہے۔ ابدالِ حق فرماتے ہیں کہ شاعر (حضور قلندر باباؒ، شاعر کو فطرت کا مزاج شناس سمجھتے ہیں) کے نزدیک تخریب و زوال کا عمل محض عبرت کی داستان نہیں بلکہ اس کے تخلیقی ذہن اور گہرائیوں میں حقیقت تلاش کرنے والی نگاہوں کے سامنے محلات، عیش گاہوں کے ٹوٹے طاق اور در و دیوار کے ذرّوں میں وہ عظیم الشان عمارتیں ایک بار پھر پوری آب و تاب سے مکمل اور منور نظر آتی ہیں جن سے شاعر کی حسین یادیں وابستہ ہیں۔ بے ثباتی اور ٹوٹ پھوٹ کے عمل میں شاعر ان مقامات کی تصویر بھی دیکھتا ہے جن میں چند لمحے گزار کر یا جن محفلوں میں شریک ہو کر اس نے رودادِ اول بیان کی تھی اور جن اشعار نے اس کی زندگی میں ہی قبولیتِ عام حاصل کر لی تھی۔ اب اگرچہ وہ در و دیوار اور محفلیں خوبیاں اور رعنائیاں کھو کر داستانِ پارینہ بن گئی ہیں مگر شاعر کا کلام اور ان محفلوں کی یاد ابھی تک محفوظ ہے۔ اس کی گواہی بھی شکستہ در و دیوار کے ذرّات دے رہے ہیں۔ امتدادِ زمانہ سے مٹی کا ڈھیر مٹی میں مل گیا مگر رودادِ اول جو مادیت اور زمان و مکان سے ماورا ہے، ابھی تک دل کی دھڑکن بنی ہوئی ہے۔

آج کی بات

آباد اور غیر آباد جتنے خطے ہیں، زمین کا شعور ہر جگہ ایک ہے۔ اس شعور کی تفہیم کے سات ارب[1] سے زیادہ زاویے اس وقت دنیا میں موجود ہیں۔ ان زاویوں کی درجہ بندی کی جائے تو انفرادی اور اجتماعی دو شعور سامنے آتے ہیں۔ انفرادی شعور میں رہنے والا فرد اصل[2] سے دور ہے جب کہ اجتماعی شعور میں وہ تمام مخلوقات شامل ہیں جن کی انفرادیت ظاہری طور پر برقرار ہے لیکن سوچ زمین کے شعور کے ساتھ سفر کرتی ہے۔

زمین کا شعور کیا ہے—؟ زمین ماں ہے جس کے باطن میں لاشمار ڈائیاں ہیں۔ ہر ڈائی ایک مخلوق ہے۔ مخلوقات کا مظاہرہ اس وقت ہوتا ہے جب پانی برستا ہے۔ پانی ڈائیوں میں داخل ہو کر رنگ رنگ تخلیقات میں ظاہر ہوتا ہے۔ ہر تخلیق پانی کا روپ ہے اور ہر روپ، بہروپ ہے جو زمین کے اندر ڈائی کی وجہ سے یکجا ہے۔ زمین تخلیقات کا یکجائی پروگرام ہے۔

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے،

> "اور زمین میں کئی طرح کے قطعات ہیں، ایک دوسرے سے ملے ہوئے۔ اور انگور کے باغ اور کھیتی اور کھجور کے درخت۔ بعض کی بہت سی شاخیں ہوتی ہیں اور بعض کی اتنی نہیں ہوتیں۔ پانی سب کو ایک ہی ملتا ہے اور ہم بعض میووں کو بعض پر ذائقے میں فضیلت دیتے ہیں۔ اس میں سمجھنے والوں کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں۔" (الرعد: ۴)

۱۔ اس دنیا میں آدمی کی آبادی سات ارب سے زیادہ بتائی جاتی ہے۔ دوسری مخلوقات اس کے علاوہ ہیں۔

۲۔ اصل سے مراد وہ مقام ہے جہاں سے فرد دنیا میں آتا ہے اور جہاں واپس چلا جاتا ہے۔

تمام تخلیقات پانی سے سیراب ہوتی ہیں — ان کا اجتماعی شعور ایک ہے۔ یہ سب جس زمین پر ظاہر ہوتی ہیں، وہ بھی ایک ہے مگر پانی میں موجود تخلیقی فارمولوں اور زمین کے اندر متفرق ڈائیوں کی وجہ سے ہر تخلیق منفرد نظر آتی ہے۔ عرض یہ کرنا ہے کہ زمین کو آسمانی دنیا کا شعور حاصل ہے اس لئے وہ آسمان سے نازل ہونے والی اشیا کو قبول کرتی ہے یعنی سماوات اور زمین کا باطنی شعور ایک ہے۔

• • ——————— • •

زمین میں شماریات سے زیادہ بیج (ڈائیاں) ہیں۔ ہر بیج کے تقاضے مختلف ہیں۔ زمین اپنے خون (پانی) سے بیجوں کی نشو و نما کرتی ہے، ان کو توانائی منتقل کرتی ہے، تقاضوں کے مطابق کفالت کرتی ہے، رہائش کے لئے بنیاد فراہم کرتی ہے اور خیال رکھتی ہے کہ جب تک بیج سے ظاہر ہونے والا فرد زمین پر موجود ہے، زمین کا رشتہ اس سے برقرار رہے۔

پیدا ہونے والا ہر بچہ ماں کا عکس ہے، اسی طرح زمین سے اگنے اور خوراک حاصل کرنے والے ہر بچے (فرد) کا جسم مٹی ہے اور مٹی کی رگوں میں زمین کا خون گردش کرتا ہے۔ زمین کا دامن ماں کے دل کی طرح وسیع ہے — مٹی سے ذرّہ پہاڑ بنتا ہے، دامن سے چشمے ابلتے ہیں جو دریا بن جاتے ہیں۔ ماں بچوں کے لئے ایثار کرتی ہے، اماں زمین بھی ایثار کی تصویر ہے کہ خود کو مغلوب کر کے ہر بچے کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے اور معیّن وقت تک اس سانچے کو قائم رکھتی ہے۔ زمین اصل سے وصل کے لئے سمٹنا چاہتی ہے مگر اپنے اندر باہر مخلوقات کے وجود کو بنیاد فراہم کرنے کے لئے لحہ لحہ فراق سے گزرتی ہے۔

• • ——————— • •

پانی ہو یا زمین — ہر تخلیق انفرادی تشخص کے ساتھ ساتھ اجتماعی شعور کی تصویر ہے۔ اجتماعی شعور یہ ہے کہ مخلوق اس بات سے واقف ہو کہ اللہ خالق، مالک اور رازق ہے اور

اللہ (رب العالمین) نے کائنات کے ہر فرد کو دوسرے فرد کی خدمت کا پابند کیا ہے۔ فرد سے مراد بادل، پانی، خلا، سورج، چاند، ستارے، چیونٹی، ہاتھی، ذرّہ، پہاڑ، وائرس، بیکٹیریا، آدمی، انسان، جنات، فرشتے اور تمام مخلوقات ہیں۔ ہر مخلوق روشنی کے مرئی اور غیر مرئی تاروں سے بندھی ہوئی ہے اور یہ روشن بندھن اللہ کا قائم کردہ ہے۔

اجتماعی شعور کی بنیاد فرماں برداری ہے۔ فرماں برداری یہ ہے کہ بندہ ہر حال اور ہر قال میں اللہ کو یاد رکھے۔ اللہ نے جس بات کا حکم دیا ہے، وہ کرے اور جس سے منع کیا ہے، اس سے دور رہے۔ جب ذہن خالقِ کائنات اللہ کی ذات و صفات میں یکسو رہتا ہے تو فرد کی زندگی اجتماعی شعور میں بسر ہوتی ہے ـــ اندر میں اس فریکوئنسی کی لہریں دَور کرتی ہیں جس فریکوئنسی پر اللہ نے مخلوقات کے درمیان ربط قائم رکھا ہے۔ اس کے برعکس جب فرد کی توجہ اللہ سے ہٹتی ہے تو وہ انفرادی شعور میں داخل ہو جاتا ہے جو سراسر نافرمانی ہے۔

• • ——————— • •

اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو جنت میں بھیجنے سے پہلے فرماں برداری کی تعلیم دی اور نافرمانی سے دور رہنے کا حکم دیا ـــ فرمایا کہ جنت میں جہاں سے جی چاہے، خوش ہو کر کھاؤ مگر ایک درخت ایسا ہے جس کے قریب نہ جانا ورنہ تم خود پر ظلم کرو گے۔

جنت وہ مقام ہے جس میں اجتماعی شعور غالب ہونے کی وجہ سے فاصلے مغلوب ہیں، وقت میں سفر ہوتا ہے، فرد جہاں جانا چاہتا ہے، پہنچ جاتا ہے، جس شے کی خواہش کرتا ہے، حاضر ہو جاتی ہے۔ جنت میں ذہن ایک ہی شعور کے تابع ہے اس لئے خیال اور مظاہرے میں فاصلہ حائل نہیں۔ دوسری طرف اسی فضا میں ایک درخت ایسا ہے جس کے قریب جانے سے جنت کی آسائشیں سلب ہو جاتی ہیں۔ اجتماعی شعور کو رد کرتے ہی انفرادی شعور غالب ہوتا ہے جس میں شک، بے یقینی اور بغاوت ہے۔

ابا آدمؑ سے سہو ہوا۔ وہ درخت کے قریب چلے گئے اور اجتماعی شعور سے نافرمانی کے مرتکب ہوئے۔ نتیجے میں وہ لباس اتر گیا جو جنت کے خواص سے آراستہ تھا اور وہ صلاحیتیں پردے میں چلی گئیں جو اسپیس کی تسخیر سے متصف تھیں۔ نافرمانی کی وجہ سے آدمؑ شک میں مبتلا ہو گئے۔ جنت کی فضا نے شک کو رد کر دیا ــــ وہ زمین پر آ گئے۔ فرماں برداری اور نافرمانی، یہ دونوں طرزیں ابا آدمؑ سے اولادِ آدمؑ کو منتقل ہوئیں۔

زمین وہ مقام ہے جہاں اجتماعی شعور پردے کے پیچھے اور انفرادی شعور غالب ہے۔ زمین کو ملنے والا پانی اور روشنی ایک ہے۔ جب یہ زمین میں داخل ہوتے ہیں تو زمین ان کو چھپا کر ان کے اندر جتنے انفرادی تشخص ہیں، انہیں ظاہر کرتی ہے۔ یہاں تک کہ زمین خود بھی چھپ جاتی ہے۔ فرد کو پہاڑ، کھیت کھلیان، عمارتیں، دریا اور سمندر دیکھتے ہوئے زمین نظر نہیں آتی لیکن زمین اپنے ہونے کا علم خود پر ظاہر ہونے والے ہر فرد میں منتقل کرتی ہے ورنہ فرد اور زمین کے درمیان ربط کا نظام سوالیہ نشان ہے۔

انفرادی شعور میں دو رنگی ہے۔ دو رنگی سے شک پیدا ہوتا ہے۔ اجتماعی شعور یک رنگ ہے، یک رنگی سے یقین کی طرزیں مستحکم ہوتی ہیں۔

اٹھارہویں صدی کے شاعر سراجؔ اورنگ آبادی نے لکھا ہے،

دو رنگی خوب نئیں یک رنگ ہو جا
سراپا موم ہو یا سنگ ہو جا

اللہ حافظ

خواجہ شمس الدین عظیمی

فقیر کی ڈاک

تفکر ــــ ذہن کی دنیا میں داخل ہونے کا راستہ ہے۔ تفکر سے خیال کی گہرائیاں روشن ہوتی ہیں۔ گہرائی میں تخلیقی رموز کے خزینے ہیں جن تک رسائی ــــ عرفانِ نفس اور معرفتِ الٰہی ہے۔ ”فقیر کی ڈاک“ اذہان کی آبیاری ہے جس میں مرشد کریم خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب شعور کے تانے بانے کو لاشعور سے جوڑ دیتے ہیں۔

محترم عظیمی صاحب ــــ السلام علیکم ورحمۃ اللہ،

آپ لاعلاج بیماریوں کے علاج اور نفسیاتی امراض سے نجات پانے کے لئے مختلف مراقبے تجویز فرماتے ہیں۔ یہی تعلیم آپ ماورائی علوم سیکھنے کے خواہش مند طالبات اور طلبا کو بھی دیتے ہیں۔

۱۔ مراقبہ میں کسی کا تصور کرنے سے مرض کیسے ٹھیک ہو جاتا ہے؟

۲۔ تصور سے کسی طالب علم کے اندر کیا تبدیلی آتی ہے؟ تصور کیا ہے؟ خود کو ترغیب دینا کہ ہم فلاں چیز دیکھ رہے ہیں یعنی خیالوں میں تصویر کشی کرنا یا پھر تصور سے کچھ اور مراد ہے؟

برائے مہربانی ان گزارشات کی وضاحت فرما دیجئے۔

ایک قاری

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ،

روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ ہم جب کسی شے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو وہ شے اور اس کے اندر معنویت ہمارے اوپر آشکار ہوتی ہے۔ شے سامنے ہے لیکن ذہنی طور پر ہم اس کی طرف متوجہ نہیں تو وہ شے ہمارے لئے بسا اوقات اہمیت نہیں رکھتی۔ مثال یہ ہے کہ ہم گھر سے روانہ ہوتے ہیں، ذہن میں ہوتا ہے کہ فلاں دوست سے ملنا ہے۔ ذہن کی مرکزیت دوست اور دوست کی جائے رہائش ہوتی

ہے۔ راستے میں بے شمار اشیا سامنے آتی ہیں اور ہم انہیں دیکھتے ہیں لیکن دوست کے گھر پہنچنے کے بعد اگر وہ ہم سے سوال کرے کہ راستے میں کیا کچھ دیکھا تو ہم خاموش ہو جاتے ہیں حالاں کہ اشیا سب نظر کے سامنے سے گزریں لیکن چوں کہ ہماری ذہنی مرکزیت کسی بھی شے میں قائم نہیں تھی اس لئے حافظے پر اس کا نقش مرتب نہ ہوا۔ قانون یہ بنا کہ جب ہم کسی شے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو شے اور اس کی معنویت سے تصوراتی طور پر واقف ہو جاتے ہیں۔

مثال: ہم فلم دیکھتے ہیں۔ شروع سے آخر تک ہماری دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ فلم ختم ہونے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ڈھائی یا تین گھنٹے گزر گئے تو ہمیں یقین نہیں آتا۔ اسی طرح ہم ایسی کتاب پڑھتے ہیں جس میں ہماری دلچسپی نہیں تو پانچ دس منٹ پڑھنے کے بعد طبیعت بوجھل ہو جاتی ہے اور ہم کتاب پڑھنا چھوڑ دیتے ہیں۔ قانون کے مطابق ذہنی مرکزیت کے ساتھ ساتھ اگر دلچسپی قائم ہو تو کام آسان ہو جاتا ہے اور وقت کا احساس نہیں رہتا۔

وقت کے دو رخ ہیں۔ عرفِ عام میں ان کو ذوق و شوق کہا جاتا ہے یعنی ایک طرف کسی شے کی معنویت تلاش کرنے کی جستجو ہے اور دوسری طرف جستجو کے نتیجے میں کوئی شے حاصل کرنے کا شوق ہے۔ ذوق اور شوق کے ساتھ جب کوئی بندہ کسی راستے کو اختیار کرتا ہے تو وہ راستہ دین کا ہو یا دنیا کا، اس کے اچھے یا برے نتائج مرتب ہوتے ہیں۔

مراقبہ میں تصور کا منشا یہ ہے کہ آدمی ذوق و شوق سے ذہنی مرکزیت کے نتیجے میں باطنی علم حاصل کرے۔ یہ کتابی علم نہیں، اس کو سیکھنے کے لئے ایسے طریقے اختیار کئے جاتے ہیں جو مروجہ طریقوں سے الگ نظر آتے ہیں۔ ان علوم کو علمِ حصولی اور علمِ حضوری دو زاویوں سے بیان کیا جاتا ہے۔

روح نور ہے، روشنی ہے۔ روحانی علوم بھی نور ہیں، روشنی ہیں۔ نور یا لہروں کا علم نور یا لہروں کے ذریعے منتقل ہوتا ہے۔ نور کا تصور جب تجویز کیا جاتا ہے تو نور کی لہریں یعنی علمِ روحانیت کی روشنیاں ذوق و شوق کے مطابق طالب علم کے اندر متحرک ہو جاتی ہیں۔

صاحبِ مراقبہ جب آنکھیں بند کر کے تصور کرے تو خود سے اور ماحول سے بے نیاز ہو جائے، اتنا

بے نیاز کہ اس کے اوپر سے زمان و مکاں کی گرفت ٹوٹنے لگے، یکسوئی اتنی ہو کہ وقت گزرنے کا مطلق احساس نہ رہے۔ تصور کے ضمن میں اس بات کو سمجھنا ضروری ہے کہ اگر نیلی روشنی کا تصور بتایا گیا ہے تو آنکھیں بند کر کے کسی خاص قسم کی روشنی کو دیکھنے کی کوشش نہ کریں، صرف نیلی روشنی کی طرف دھیان دیں۔ نیلی روشنی جو کچھ ہے، جس طرح ہے، ازخود سامنے آجائے گی۔

دوست سے ملاقات کی مثال سے واضح ہے کہ دوست کے گھر جاتے ہوئے اس کے گھر کا نقشہ، بناوٹ یا طرزِ تعمیر ذہن میں نہیں لاتے۔ گھر، گھر کا مخصوص کمرا یا ڈرائنگ روم جہاں ہم اٹھتے بیٹھتے ہیں، آٹو میٹک طریقے سے اس کا عکس ذہن میں آجاتا ہے۔ دوست جیسا بھی ہے، اس کی صفات، عادات و خصائل سب کچھ ہیولے کی صورت میں ذہن پر واضح ہو جاتا ہے۔ اس کے لئے ذہن کے کینوس پر کوئی اسکیچ بنانا نہیں پڑتا۔ امرِ خاص یہ ہے کہ فرد کسی طرف دھیان کر کے ذہنی یکسوئی حاصل کرتا ہے اور اس کے نتیجے میں منتشر خیالات سے نجات پاتا ہے جس کے بعد لاشعوری کیفیات کڑی در کڑی ذہن پر منکشف ہوتی ہیں۔

تصور کا مطلب اس بات سے کافی حد تک واضح ہو جاتا ہے جس کو عرفِ عام میں ایک خیال میں بے خیال ہونا کہتے ہیں۔ ہم اگر کھلی یا بند آنکھوں سے کسی چیز کا تصور کرتے ہیں اور تصور میں خیالی تصویر بنا کر اسے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ عمل ذہنی یکسوئی کے زمرے میں نہیں آتا۔ ذہنی یکسوئی سے مراد یہ ہے کہ آدمی شعوری طور پر دیکھنے اور سننے کے عمل سے وقتی طور پر بے خبر ہو جائے۔

(قانون) آدمی کسی لمحے بھی حواس سے ماورا نہیں ہوتا۔

جب شعوری حواس کا غلبہ نہیں رہتا تو لاشعوری حواس متحرک ہو جاتے ہیں اور لاشعوری حواس سے متعارف ہونا ماورائی علوم کا دروازہ ہے۔

دعاگو، عظیمی

نامے میرے نام

"ماہنامہ قلندر شعور" نے قارئین خواتین و حضرات کو رسالے کے پلیٹ فارم سے تفکر کی دعوت دی ہے۔ رابطے کے قدیم و جدید وسائل کے ذریعے موصول ہونے والے خطوط شائع کئے جارہے ہیں۔ ادارہ "ماہنامہ قلندر شعور" کا قارئین کے تفکر سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

اپریل 2023ء کے "آج کی بات" پر موصول تفکر نامے میں سے منتخب خطوط:

◈ صائم فیاض (اسکاٹ لینڈ): اپریل 2023ء کے اداریے میں اکثر باتیں ایسی ہیں جو ہمارے سامنے کی ہیں جیسے سورج کے طلوع و غروب سے روشنی اور اندھیرا پھیلنے کا نظام۔ سوچ رہا ہوں کہ میں نے آج سے پہلے اس پر غور کیوں نہیں کیا—؟ منشور (Prism) کی مثال میں فریبِ نظر اور حقیقت، لہروں کے درمیان اسپیس کا پھیلنا اور سمٹنا، رنگ و روشنی اور غیب ظاہر غیب کی وضاحت ہے۔

◈ شہناز نذیر (اٹک): زندگی ریکارڈ کا مظاہرہ ہے۔ ریکارڈ کو پڑھنے کی ایک طرز "لیلۃ القدر" کے حواس ہیں جن میں شعور کی رفتار 60 ہزار گنا سے زیادہ ہو جاتی ہے۔ جب شعور، لاشعور کی سطح پر آجائے تو شے کو اس مقام پر دیکھا جاسکتا ہے جہاں وہ ریکارڈ ہے۔ اس کے برعکس مادی شعور سے ریکارڈ کو صرف ٹکڑوں میں پڑھا اور دیکھا جاسکتا ہے۔

◈ نازش بختیار (اسلام آباد): "آج کی بات" پڑھتے ہوئے جب تیسرے صفحے پر شبِ قدر کا ذکر آیا تو سارے نکات کتاب کے صفحات کی طرح کھلتے گئے اور ایسا محسوس ہوا کہ ابتدائی دو صفحات میں ذہن کی زمین کو نرم کیا گیا ہے، تیسرے صفحے پر پہنچ کر بیج بویا گیا ہے اور آخری صفحے پر زمین کو پانی دیا گیا ہے۔ تحریر میں گہرائی بہت ہے۔ جو مفہوم ذہن میں آتا ہے، تھوڑی دیر میں غائب ہو جاتا ہے۔

◈ آفتاب (کراچی): عدم کی تعریف سمجھنے کی کوشش کی۔ کیا دماغ یا شعور کو عدم کہیں گے؟

◈ عبید رانا (فیصل آباد): ٹائم سے مراد حرکت ہے جب کہ اسپیس حرکت کا مظاہرہ ہے۔ ٹائم میں اطلاع روشنی کی حالت میں رہتی ہے، اسپیس میں بھی اطلاع روشنی ہے مگر ہمیں روشنی نظر نہیں آتی بلکہ ان کے درمیان خلا نظر آتا ہے جو دراصل اطلاع کا ٹکڑوں میں تقسیم ہونا ہے۔

◈ شبانہ انیس (لاہور): اطلاع کی قبولیت میں طرزِ فکر کی بہت اہمیت ہے جیسے پانی کو جس سانچے میں ڈالیں، وہ شکل بن جاتی ہے۔ منشور کی مثال سے روشنی کی wave length کو سمجھنے میں آسانی ہوئی۔ اس میں بصارت کے مختلف درجات بتائے گئے ہیں۔ اطلاع روشنی ہے اور منشور اسکرین کے قائم مقام ہے۔ لاشعور سے روشنی آتی ہے اور ہماری طرزِ فکر (جو ماحول میں موجود قدروں سے بنی ہے) کے سانچے میں ڈھل کر مظہر بن جاتی ہے۔

◈ ہانیہ اشفاق (پشاور): دانشوروں نے اپنے تئیں زندگی کی تعریف بیان کی ہے۔ کسی نے یہ بھی کہا ہے کہ زندگی کی جامع تعریف نہیں ہوسکتی۔ آپ نے ''آج کی بات'' میں تحریر فرمایا ہے کہ ''زندگی اطلاع ہے''۔ میری دانست میں یہ ہر لحاظ سے زندگی کی مکمل تعریف ہے۔ لفظ ''اطلاع'' سے زندگی کا مفہوم واضح ہوتا ہے۔ اطلاع آتی ہے تو حرکت ہوتی ہے، اطلاع نہ آئے تو فرد ڈیڈ باڈی ہے۔

◈ ڈاکٹر مشتاق احمد (کراچی): اللہ رحمٰن و رحیم ہے۔ جب بندہ نعمتوں پر شکر ادا کرنے کے ساتھ رحمٰن و رحیم ہستی کے بارے میں تفکر کرتا ہے تو فہم کے روزن کھلتے ہیں۔

◈ انس حفیظ (ملتان): ''آج کی بات'' میں یہ پڑھ کر کہ آدمی جس درجے میں اطلاع کو دیکھتا ہے، وہ اسفل سافلین کا مقام ہے، میرے ذہن پر ضرب پڑی ہے۔

◈ حسنین علی (سکھر): محترم عظیمی صاحب کی تحریر کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ رموز بیان کرتے ہیں، مثالوں سے سمجھاتے ہیں اور لفظ کو پڑھنا بھی سکھاتے ہیں جیسے اطلاع کا مادہ طلع اور طلع کے معنی طلوع ہونا۔ طلوع کے نظام کو سمجھنے کی کوشش کی تو دماغ کی اسکرین پر کلی کی تصویر کھل بند ہونے لگی۔

◈ عدنان نذیر (اٹک): ہر شے اور فرد اطلاع ہے۔ اطلاع کے سورس سے واقف ہونا زندگی ہے اور زندگی بندگی ہے۔ بندگی کے حصول کے کئی طریقے ہیں جیسے لیل (رات کے حواس)، روزہ (ترک)

اور قرآن کریم میں غور و فکر۔ سورۃ بنی اسرآءیل (آیت 78) میں ارشاد ہے، "صلوٰۃ قائم کرو زوالِ آفتاب سے لے کر اندھیرے تک اور فجر میں قرآن پڑھو۔ فجر میں قرآن پڑھنا مشہود ہوتا ہے۔"

◈ انیس احمد (لاہور): اطلاع کے معانی آگاہی، ابھرنا اور ظاہر ہونا ہے۔ ہر چیز روشنی ہے اور روشنی مقداروں کا مجموعہ ہے۔ ہر دو مقداروں میں فاصلہ ہے۔ فاصلہ نہ ہو تو ہم کسی چیز کو نہیں دیکھتے۔ آپ نے سورج کے طلوع و غروب سے روشنی اور اندھیرے کا میکانزم سمجھایا ہے کہ جب سورج غروب ہوتا ہے تو روشنی کی مختلف فریکوئنسیوں کے درمیان فاصلہ سمٹتا ہے جس سے اندھیرا غالب ہو جاتا ہے۔ طلوع ہونے سے مقداروں کے درمیان فاصلہ بڑھتا ہے جس کو ہم روشنی کا پھیلنا سمجھتے ہیں۔

◈ نزہت (کراچی): اطلاع جہاں ریکارڈ ہے، اس مقام کو دیکھنے کے لئے خالی الذہن ہونا ضروری ہے۔ روزے میں کم بولنے، کم کھانے اور کم سونے سے خالی الذہن (یکسو) ہونے میں آسانی ہوتی ہے۔

اپریل 2023ء کے مضامین پر قارئین کی آراء اور تبصرے:

◈ عبدالمعید (اسلام آباد): بلال حسن کی تحریر "★ ★" اس ماہ کا بہترین مضمون ہے۔ یہ بات پڑھ کر چونک گیا کہ ستارے کی روشنی کا جلنا بجھنا دراصل ان نگاہوں کو اندر داخل ہونے سے روکتا ہے جن میں شک ہے۔ منفرد زاویے سے روشنی کے درجات (رفتار) اور آسمانی دنیا کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بلال حسن کے تقریباً تمام مضامین میں فطرت کا باریک بینی سے مطالعہ ہے۔ دیگر لکھنے والے بھی اچھا لکھ رہے ہیں۔ ملک ناصر صاحب، منیزہ اظہر، ڈاکٹر نعیم ظفر، مریم بی بی اور عرفانہ شہزاد سب کی تحریریں پسند آئیں۔ "ماہنامہ قلندر شعور" نے اس پُر آشوب دور میں باطنی علوم کے متلاشیوں کی پیاس بجھائی اور بڑھائی ہے۔

◈ کشف ناز (سرگودھا): خواتین کے بارے میں منیزہ اظہر کے مضامین معلوماتی اور دلچسپ ہیں۔ باصلاحیت خواتین کے حالاتِ زندگی شائع کرنے کا سلسلہ جاری رہنا چاہئے۔

◈ شبانہ (بھٹو کالونی): آپ سے گزارش ہے کہ جس طرح "مرشد کی باتیں" کتابی شکل میں شائع کی گئی، عرفانہ شہزاد کی تحریر "سنا کس نے" کو بھی کتاب کی شکل دی جائے۔

◈ عثمان (مرید کے): سرورق پر حضرت بو علی شاہ قلندرؒ کا کلام پڑھا۔ عمدہ بات لکھی ہے،

"جب تک تو ہے، یار تیرا یار کب ہوگا"

سرورق کی تشریح میرے پسندیدہ سلسلوں میں سے ہے۔ مکمل مینا کون ہیں؟

◈ نوید (دبئی): اولیائے کرام کی تعلیمات پر مضامین جس انداز میں "ماہنامہ قلندر شعور" میں پیش کئے جاتے ہیں، اس میں خاص بات یہ ہے کہ آپ نے ان مضامین کو محض کرامات تک محدود نہیں رکھا بلکہ کرامات کی توجیہہ بھی لکھی جاتی ہے جس سے قاری کو معلوم ہوتا ہے کہ اولیاءاللہ کا علم سائنس دانوں سے بہت اعلیٰ ہے اور ان کی کرامات کے پیچھے پوری ایک سائنس ہے۔

اعلان

ادارہ "ماہنامہ قلندر شعور" نے مارچ 2023ء کے شمارے میں امتحانی پرچہ شائع کیا تھا۔ سینکڑوں کی تعداد میں جوابی پرچے موصول ہوئے۔ حل شدہ پرچے اس وقت ممتحن کے پاس ہیں اور چیکنگ کے مراحل میں ہیں۔ امتحان کے نتائج جولائی 2023ء کے شمارے میں شائع کئے جائیں گے، انشاءاللہ۔

◈ سعدیہ خاتون (گجرات): پرانے لکھنے والے غائب ہو رہے ہیں اور نئے لکھنے والے اپنی جگہ بنا رہے ہیں۔ یہ دنیا کی رِیت ہے۔ نئے لکھنے والے بہت اچھا لکھ رہے ہیں مگر پرانے لکھنے والوں کو بالکل غائب نہیں ہونا چاہئے، کبھی کبھی قلم اٹھانا چاہئے۔

◈ شہناز عمیر (میرپور): پیراسائیکالوجی کا کالم اب شائع نہیں ہوتا۔ کیا یہ کالم مستقل طور پر روک دیا گیا ہے؟ اگر ایسا ہے تو اس کی کیا وجہ ہے؟ میں بہت شوق سے پڑھتی تھی۔

◈ نواز (شہر کا نام نہیں لکھا): 1997ء سے بیعت ہوں۔ مراقبہ کرتا ہوں۔ میں غیب سے آ رہا ہوں اور غیب میں جا رہا ہوں۔ اب تک غیب کا مشاہدہ نہیں ہوا۔ خاص نظرِ کرم کی درخواست ہے۔

آپ کا ہر دلعزیز رسالہ "ماہنامہ قلندر شعور" آن لائن مطالعے کے لئے دستیاب ہے۔ "ماہنامہ قلندر شعور" کے ڈیجیٹل ایڈیشن کی سبسکرپشن کے لئے ویب سائٹ پر موجود فارم پُر کیجئے۔ ہمارا ویب ایڈریس یہ ہے،

https://qalandarshaoormonthly.online/

حامد ابراہیم

آئن اسٹائن کے انتقال کے بعد

ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے اور ستاروں کے درمیان وسیع خلا ہے لیکن اسٹرنگ تھیوری کے مطابق زمین پر اور خلا میں لاشمار ڈائی مینشن موجود ہیں اور ہر ڈائی مینشن ایک دنیا ہے۔

عالمین کے خالق اللہ کا ارشاد ہے،

"آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، سب کا رب ہے۔ اگر تم یقین رکھنے والے ہو۔" (الدّخان: ۷)

زمین سیارہ ہے جس پر بے شمار مخلوقات آباد ہیں، بر اعظم اور سمندر ہیں، میدان، ریگستان، پہاڑ اور جنگلات ہیں۔ قرآن کریم میں عالمین کا لفظ ایک سے زائد مرتبہ ہے۔ ہماری زمین کی طرح کائنات میں بے شمار زمینیں ہیں۔

چند دہائیاں پہلے محققین اور ماہرینِ فلکیات تسلیم کرنے سے گریزاں تھے کہ زمین کے علاوہ بھی کائنات میں بہت سے آباد سیارے یا زمینیں ہیں۔ جدید دوربینیں ایجاد ہونے کے بعد وہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہماری زمین کے علاوہ کائنات میں لاشمار زمینوں کی موجودگی ممکن ہے۔

قرآن کریم میں سماوات کا بھی ذکر ہے۔ مادی علوم سماوات کی تشریح سے قاصر ہیں کہ زمین کے شعور سے سماوات کو سمجھنا اور ان میں داخل ہونا ممکن نہیں — زمینی شعور میں رہتے ہوئے زمین سے نکلنا بھی ناممکن ہے۔

"اے گروہ جن وانس! تم آسمانوں اور زمین کے کناروں سے نکل سکتے ہو تو نکل کر دکھاؤ، تم نہیں نکل سکتے مگر سلطان سے۔"

(الرحمٰن : ۳۳)

سماوات ، زمین اور ان کے درمیان: قرآن کریم میں یہ تین حصے کئی آیات میں یکساں وزن کے ساتھ اکٹھے بیان ہوئے ہیں۔ قرآن کریم کے الفاظ "ومابینھما" میں وضاحت ہے کہ زمین اور آسمان کے درمیان دنیائیں آباد ہیں۔

سائنسی تحقیقات اور نظریات:

۱۔ کائنات کی بنیاد کس شے پر ہے؟

۲۔ ابعاد (Dimensions) کی حقیقت کیا ہے؟

اس موضوع پر تحقیق و تلاش (سائنس) کا سفر دلچسپ ہے۔ تقریباً ڈھائی ہزار سال پہلے یونانی فلسفی دیمقراطس نے کہا کہ مادی کائنات کی بنیاد انتہائی چھوٹے ذرّات (ایٹموں) پر ہے۔ دیمقراطس کے ہم عصر فلسفی اور ریاضی دان فیثاغورث نے مختلف نظریہ پیش کیا کہ کائنات ارتعاش یا وائبریشن پر مبنی ہے اور اس ارتعاش کو آواز بھی کہا جاسکتا ہے۔ اس کے مطابق ہر شے ارتعاش کی مخصوص فریکوئنسی ہے۔

دیمقراطس کے ایٹمی نظریے کو زیادہ پذیرائی ملی۔ تقریباً دو ڈھائی ہزار سال بعد دریافت ہوا کہ ایٹم جزوِ لاتجزّا نہیں ہے بلکہ مزید ذرّات پر مشتمل ہے اور یہ ذرّات بھی کئی چھوٹے ذرّات پر مشتمل ہیں۔ اس کے بعد ہر سال نئے قسم کے ذرّات دریافت ہونے لگے اور تعداد دو سو سے تجاوز کر گئی۔ ابتدا میں اس پر نوبیل انعام دیئے گئے۔ تعداد بڑھنے پر نوبیل انعام دینے والے ادارے کو فکر لاحق ہو گئی۔

نیا نظریہ پیش ہوا کہ بعض ذرّات کسی محرک کی بنا پر یا وقت گزرنے کے ساتھ دوسری قسم کے ذرّات میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ محقق یہ سوچنے پر مجبور ہوئے کہ ایٹمی اور ذیلی ذرّات کی بنیاد ایک ہی شے ہے اور یہ روشنی یا توانائی کی لہریں ہیں جو ڈوریوں کی صورت میں حرکت کرتی ہیں۔ یہاں سے نظریۂ خیوط وجود میں آیا جسے انگریزی میں String theory کہتے ہیں۔

خیوط — خیط کی جمع ہے جس کے معانی فیتے، ڈوریاں یا لہریں ہیں یعنی توانائی کی چھوٹی چھوٹی لہریں فیتوں کی شکل میں ہیں۔ جس طرح ڈوری یا فیتے کو اوپر نیچے حرکت دینے سے سینکڑوں اقسام کی فریکوئنسی کی لہریں پیدا ہوتی ہیں، اسی طرح توانائی کے فیتے مختلف فریکوئنسی کی لہروں میں حرکت کرتے ہیں اور ہر حرکت سے ایک ذرّہ پیدا ہوتا ہے۔

مثال: بچے کے ہاتھ میں لچک دار فیتے کا سرا ہے جس کا مخالف سرا دیوار پر کیل سے بندھا ہوا ہے۔ بچہ فیتے کو حرکت دیتا ہے تو مخصوص لہر پیدا ہوتی ہے جس سے الیکٹران وجود میں آتا ہے۔ بچہ فیتہ ہلانے کی تعداد تبدیل کرتا ہے یعنی دوسری فریکوئنسی میں فیتے کو حرکت دیتا ہے تو اس سے پروٹان، تیسری فریکوئنسی

سے نیوٹران، چوتھی فریکوئنسی میں ہلانے سے پازیٹران اور پانچویں میں حرکت دینے سے نیوٹرینو وجود میں آتا ہے۔ الغرض رسّی یا فیتے میں پیدا ہونے والی ہر لہر مختلف ذرّات کو جنم دیتی ہے۔ اس طرح اسٹرنگ تھیوری کے مطابق ہر قسم کے ایٹمی ذرّات کی بنیاد ایک ہی توانائی یا روشنی ہے۔

اس نظریے کو بڑی پذیرائی ملی۔ نامور محققین نے اسے آئن اسٹائن کی جدوجہد کی تکمیل قرار دیا۔ آئن اسٹائن نظریۂ اضافیت اور کششِ ثقل کا نیا نظریہ پیش کرنے کے بعد ایسے نظریے کی تلاش میں تھا جو کائنات کی تمام توانائی اور عوامل کی یکجا طور پر وضاحت کرے۔ اس نے اسے Theory of Everything کا نام دیا۔ اردو میں اسے نظریۂ کل شئ کہا جاتا ہے۔

اس قسم کے نظریے کی تلاش میں بہت مشکل پیش آئی۔ وجہ یہ تھی کہ اس سے پہلے اس کے پیش کئے گئے نظریۂ اضافیت میں مادے کی پیمائش، اس کی ایٹمی سطح کی تحقیق، کششِ ثقل کے ضمن میں زمین، چاند، سورج، سیارے اور ستارے حوالے کے طور پر موجود تھے مگر تھیوری آف ایوری تھنگ کی تشکیل کے لئے کوئی مادی حوالہ موجود نہیں تھا۔ آئن اسٹائن اس صورتِ حال سے فکرمند رہنے لگا۔ زندگی کی مہلت ختم ہوئی اور کوشش ادھوری رہ گئی۔

کوانٹم طبیعیات میں جب یہ دریافت ہوا کہ چھوٹے ایٹمی ذرّات مثلاً الیکٹران ایک ہی لمحے میں دو جگہ پر موجود ہو سکتے ہیں اور ایک ہی لمحے میں ایک جگہ تخلیق پانے والے ایٹمی ذرّات خواہ مخالف کناروں پر ہوں، ان میں ایک خاص رابطہ رہتا ہے تو آئن اسٹائن اور کوانٹم طبیعیات کے ماہرین کے لئے یہ دریافت بہت عجیب تھی کیوں کہ اس سے ایک طرف نظریۂ اضافیت میں ابہام پیدا ہوتا ہے اور دوسری طرف یہ نظریہ روشنی کی رفتار سے کہیں زیادہ تیز ہونے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

آئن اسٹائن کے انتقال کے بعد جب اسٹرنگ تھیوری آئی تو محققین خصوصاً نظریاتی و ریاضیاتی ماہرینِ طبیعیات نے اسے بخوشی قبول کر کے تھیوری آف ایوری تھنگ کی بنیاد قرار دیا۔ یہ تھیوری کائنات میں تمام قوتوں اور مظاہر کو یکجا طور پر سمجھنے میں مددگار رہی البتہ تجرباتی طور پر ثابت نہ ہونے کی وجہ سے محققین کی ایک بڑی

تعداد اس نظریے پر تنقید کرتی ہے پھر بھی ان کے لئے اسے رد کرنا مشکل ہے کیوں کہ ریاضی میں اس کی جڑیں گہری ہیں۔

دوسرا یہ کہ ایٹم کے ذیلی ذرّات کی بنیادی ساخت کے بیان کے لئے فی الحال اس سے بہتر کوئی نظریہ ان کے پاس نہیں۔

دلچسپ خصوصیات: اسٹرنگ تھیوری بیک وقت لاشمار کائناتوں کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اس امکان کو Multiuniverse کہا جاتا ہے۔ یہ نظریہ تین جہات (تھری ڈائی مینشن) کی بجائے بہت سی جہتوں یا ڈائی مینشن کی موجودگی کا انکشاف کرتا ہے۔

مثال: رات کو ستارے نظر آتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے اور ستاروں کے درمیان وسیع خلا ہے لیکن اسٹرنگ تھیوری کے مطابق زمین پر اور خلا میں لاشمار ڈائی مینشن موجود ہیں اور ہر ڈائی مینشن ایک دنیا ہے۔

اعتراضات: یہ نظریہ زیادہ تر ان چیزوں کی طرف اشارہ کرتا ہے جنہیں مادی طور پر پرکھا نہیں جاسکتا۔ اس کی حمایت اور رد میں محققین میں گروہ بن چکے ہیں۔ جنہوں نے اس نظریے میں پی ایچ ڈی کی ہے، وہ اسے انقلابی نظریہ قرار دیتے ہیں کیوں کہ یہ نظریہ ریاضی اور نظریاتی طبیعیات میں اہمیت رکھتا ہے اور یونیورسٹیوں میں اس کی باقاعدہ تعلیم دی جاتی ہے۔

غیر جانبدار فرد دیکھتا ہے کہ جن نظریات کو رد کیا گیا، ان میں ریاضی کی رُو اور تکنیکی اعتبار سے غلطیاں تھیں البتہ وہ نظریات جو تجرباتی طور پر ثابت نہ ہوسکے لیکن ان کی جڑیں ریاضی میں مضبوط تھیں، ان کو رد نہیں کیا جاسکا۔ سائنس اور ریاضی میں جذبات کی بجائے استدلال، اطلاق، تکنیک اور تجربے کی اہمیت ہے۔ اسٹرنگ تھیوری کی جڑیں ریاضی میں گہری ہیں، اسے رد کرنا ممکن نہیں پھر بہت سے محققین اسے رد کرنے پر مُصر کیوں ہیں—؟ تحقیق کی دنیا میں یہ طرزِ عمل پہلے نہیں دیکھا گیا۔ کسی نظریے کے بارے میں جذباتی بات کی جاتی تو اس رویے کو سائنس اور ریاضی کے منافی قرار دیا جاتا۔ اس نظریے کے لئے یہ رویہ کیوں نہیں؟

عظیم روحانی سائنس دان ابدالِ حق حضور قلندر بابا اولیاءؒ فرماتے ہیں،

"بیسویں صدی کے نصف اول میں انسان تمام

میدانوں سے بھاگ نکلا۔ اس نے فیصلہ کر دیا کہ ایتھر موجود نہیں ہے، یہ صرف پہلے لوگوں کا مفروضہ تھا۔ اس دور کے سائنس دان روح سے بیزار ہو ہی چکے تھے۔ ان کو یہ خیال ہوا کہ کہیں ایتھر کی جگہ روح نہ آجائے۔ ان نظریات کو کہ آنکھوں کی روشنی باہر دیکھتی ہے، وہ پہلے ہی نظر انداز کر چکے تھے۔ نئے نظریات کی رُو سے خارجی دنیا کی روشنی ہماری آنکھوں میں داخل ہو کر دماغی اسکرین پر شبیہیں اور علامتیں بناتی دکھائی دینے لگیں۔"

ایتھر کے نظریے سے روح کی موجودگی کا امکان ظاہر ہوا تو محققین کے ایک گروہ نے اس کو رد کر دیا۔ یہی صورتِ حال اسٹرنگ تھیوری کے ساتھ پیش آئی لیکن ریاضی اور ریاضیاتی طبیعیات میں اس کی بنیاد مستحکم ہونے کی وجہ سے اسے رد کرنا فی الحال ممکن نہیں۔

قارئین کرام! سائنس کی بنیاد اگرچہ مادی حواس ہیں لیکن سائنس کا طریقِ کار اپنی اصل میں غیر جانبدار رہے اور اس طریقِ کار کے تحت کی گئی تحقیقات لامحالہ اس جانب بڑھ رہی ہیں کہ مادی کائنات کے پس پردہ حقائق کچھ اور ہیں اور وہی حقائق کائنات کا اصل رخ ہیں۔ روح سے فرار سائنس کے طریقِ کار میں شامل نہیں۔ ایسا کرنے والوں کا طرزِ عمل ذاتی اور غیر سائنسی ہے۔ سائنس کا اصل نظریہ غیر جانبداری سے کھوج لگانا ہے اور جو حقائق ظاہر ہوں انہیں کھلے دل سے تسلیم کرنا ہے۔

یہ ضروری نہیں کہ مخفی ڈائی مینشن (دنیائیں) کائنات کے دور دراز گوشوں میں ہوں، ہمارے ارد گرد بھی ہو سکتے ہیں۔ روح میں صلاحیت ہے کہ وہ کسی بھی ڈائی مینشن میں داخل ہو جاتی ہے۔ عام آدمی اور محقق دونوں سے سوال ہے،

① جنات کی دنیا کہاں ہے؟
② فرشتوں کی دنیا کون سی ہے؟
③ روح کہاں سے آتی ہے اور آدمی کے مرنے کے بعد جہاں منتقل ہوتی ہے، وہ دنیا کہاں ہے؟
④ خواب کا ڈائی مینشن کون سا ہے؟
⑤ ڈائی مینشن سے مراد شعور کی ایک سطح بھی لے سکتے ہیں۔ شعور کی کتنی سطحیں ہیں؟
⑥ ایک ڈائی مینشن مادی زندگی ہے جسے قرآن نے دن کہا ہے۔
⑦ ایسے میں صرف ایک ڈائی مینشن کو کُل کائنات سمجھنا نامناسب نہیں؟

زیر سرپرستی

اللہ کے دوست حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی

عظیمیہ روحانی لائبریری

برائے خواتین

روحانی علوم کے متلاشی خواتین وحضرات، راہِ سلوک کے مسافر اور ــــ روحانی سائنس میں دلچسپی رکھنے والے طالبات وطلبہ کے لئے عظیمی صاحب کی کُتب اور تصوف کی دیگر کتابیں مطالعہ کے لئے موجود ہیں۔

فری ممبرشپ
فری مطالعہ

مکان نمبر 65 بلاک A-2، پنجاب ہاؤسنگ سوسائٹی

نزد جوہر ٹاؤن، لاہور۔ فون نمبر: 042-35185142

بلال حسن

کہتی ہے یہ مٹی بھی بہت سی باتیں

کیا آپ نے سوچا ہے کہ مٹی مسلسل تغیر سے گزرتی ہے لیکن مستقل طور پر غائب نہیں ہوتی، لاشمار اشکال اختیار کر کے پھر مٹی بن جاتی ہے ۔۔۔؟

زمین پر پیدا ہونے والی تمام چیزوں کی بنیاد ایک ہے لیکن شکل و صورت مختلف ہونے سے ان کی حیثیت اعتباری ہے۔ مٹی ایک ہے، اس سے ہاتھی کا جسم بنتا ہے اور چیونٹی کا بھی، پہاڑ تخلیق ہوتا ہے اور ذرّہ بھی، پھول کا لباس مٹی ہے اور پرندے کے رنگ بھی مٹی کا روپ ہیں۔ ان کی شناخت معین وقت پر ختم ہو جاتی ہے، ذرّات رہ جاتے ہیں اور ایک زمانہ گزرنے کے بعد ذرّات پانی میں چھپ جاتے ہیں۔

ابدالِ حق نے ایک رباعی میں فرمایا ہے،

کہتی ہے یہ مٹی بھی بہت سی باتیں
باتوں میں گزر گئی ہیں اکثر راتیں
مٹی کے یہ ذرّات کبھی انسان تھے
تھیں ان کی کبھی شیخ و برہمن ذاتیں

کیا مٹی بذاتِ خود مستقل ہے؟

کیا مٹی کا روپ بہروپ نہیں ہے؟

مٹی سے بنی مخلوقات گھٹتی بڑھتی ہیں، چھپتی اور ظاہر ہوتی ہیں۔ جب مخلوق کو گھٹنے بڑھنے کی صفت مٹی سے ملی ہے تو یہی صفات مٹی میں بھی مظہر بن رہی ہیں۔ مٹی سمٹتی ہے اور پھیلتی ہے، بار بار رنگ بدلتی ہے۔

ذرّہ چھوٹے سے چھوٹا کیوں نہ ہو، مادی آنکھ سے نظر آتا ہو یا حساس خوردبینوں کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہو۔۔۔ تقسیم در تقسیم ہو کر غائب ہو جاتا ہے۔ مٹی سے بننے والی اشکال کی طرح خود مٹی بھی اعتباری ہے۔ اگر مٹی ایک حالت پر قائم رہتی تو اس سے بننے والی چیزوں میں نقش و نگار کی تبدیلی اور گھٹنے بڑھنے کا عمل نہ ہوتا۔

قدرت نے مخلوق کے جسم کی تخلیق کے لئے متغیر مادے کا انتخاب کیا ہے یا مادے میں تغیر

رکھا ہے۔ مادہ (matter) ہر دنیا میں موجود ہے اور ہر دنیا میں اس کی نوعیت مختلف ہے۔ مادے میں تغیر کی وجہ سے مخلوق پیدا ہوتی ہے، گھٹتی بڑھتی ہے اور غیب ظاہر غیب میں ردّوبدل ہوتی ہے۔ تغیر نہ ہو تو پیدائش اور موت نہیں ہوگی۔ کائنات کی ہر شے میں تغیر ہے، صرف اللہ تعالیٰ کی ذات تغیر سے پاک ہے۔

مادی نظر ظاہری دنیا کو حقیقی سمجھتی ہے کیوں کہ یہ اس کے لئے قابلِ شناخت ہے۔ وہ اس میں خدوخال دیکھ لیتی ہے، ان میں معنی پہناتی ہے اور خود کو ان سے منسوب کرتی ہے۔ دیکھنے کی اس طرز میں فرد اس مظہر کو تسلیم کرتا ہے جو گھٹتا بڑھتا ہے اور اس حقیقت سے ناواقف رہتا ہے جس کی وجہ سے گھٹنے بڑھنے کا عمل قائم ہے۔

زید مادی سائنس کا طالب علم ہے۔ اس سے پوچھا جائے کہ ہوا کی شکل کیسی ہے، وہ کہے گا کہ ہوا گیسوں کا مجموعہ ہے، یہ formless ہے، اس کی اپنی کوئی شکل نہیں البتہ جس خول میں داخل ہوتی ہے، اس کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

یہی سوال مابعد الطبیعیات یعنی باطنی علوم کے ماہرین سے پوچھا جائے تو وہ بتاتے ہیں کہ ہوا مخلوق ہے، باشعور ہے، پیدا ہوتی ہے اور مرتی ہے، ہر مخلوق کی طرح اس کی شکل و صورت بھی ہے۔ ہوا کی شکل کیسی ہے؟

محترم عظیمی صاحب نے کتاب ''خاتم النبیین محمد رسول اللہؐ، جلد دوم'' میں ہوا کی ساخت کے بارے میں لکھا ہے۔

''روح کی آنکھ دیکھتی ہے کہ ہوا ایک مخلوق ہے۔ اس مخلوق میں تناسل کا سلسلہ جاری ہے۔ ہوا بچپن کا دور گزار کر جوان ہوتی ہے اور جوانی کے بعد اس پر انحطاط بھی آتا ہے۔ ہوا ایک جرثومہ ہے جو ثابت مسور کی دال کی طرح ہے۔ یہ گول، چپٹا اور چکنا جرثومہ بیکٹیریا سے زیادہ چھوٹا اور بیکٹیریا سے زیادہ تیزی سے نشوونما پاتا ہے۔ ہوا کی تخلیق کے زون کھلے ریگستان اور سمندر کی اندرونی سطح ہے۔''

مادے سے واقف نگاہ اپنی فہم تک محدود ہے اور اسی فہم سے دنیا کو دیکھتی ہے۔ محدودیت سے نکلنے کے لئے قدرت نے مخلوق کے اندر ذوق و شوق رکھا ہے۔ ذوق کیا ہے؟

ابدالِ حق قلندر بابا اولیاءؒ نے ایک مکتوبِ گرامی میں ذوق اور مٹی کی نسبت کو بیان کیا ہے۔

مکتوبِ گرامی کا ایک حصہ پیشِ خدمت ہے۔

"اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں،
'یہ کتاب ان لوگوں کو روشنی دکھاتی ہے جو اپنے اندر اللہ کے بارے میں ذوق رکھتے ہیں۔'
(البقرۃ: ۲-۳)

دوسری جگہ ارشاد ہے،
'میں نے انسان کو بجنی مٹی سے بنایا ہے۔'
(الحجر: ۲۶)

یہاں مٹی کی فطرت (nature) بیان کی گئی ہے جو خلا ہے۔ یہ بات سمجھنا بہت آسان ہے کہ ذوق میں نہ وزن ہوتا ہے نہ ذوق کے لئے فاصلہ کوئی معنی رکھتا ہے، نہ ذوق زمین و آسمان کی حدود کا پابند ہے، نہ اسے وقت پابند بنا سکتا ہے۔ یہی ذوق چلتا پھرتا ہے۔ یہ بات ضرور ہے کہ انسان اِس سے اُس وقت تک متعارف نہیں ہوتا جب تک اس سے تعارف حاصل نہ کرے۔ جب تعارف حاصل کر لیتا ہے تو اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہی ذوق انسان ہے۔ یہ پوری کائنات میں آزاد ہے، فرشتوں کا سربراہ ہے، اللہ کی بہترین صنعت ہے اور کائنات میں اللہ کا نائب ہے۔ نہ وہ پیروں سے چلنے اور ہاتھوں سے پکڑنے کا پابند ہے، نہ وہ آنکھوں سے دیکھنے اور کانوں سے سننے کا محتاج ہے۔ یہ ساری خرافات انسان نے آپ ہی تخلیق کی ہیں اور آپ ہی ڈھول بجاتا پھرتا ہے کہ ہائے، میں تو بالکل مجبور ہوں۔"
(کتاب: تذکرہ قلندر بابا اولیاءؒ)

ذوق مٹی میں تغیر کی صفت سے آزاد کر کے لامحدود فہم کے دروازے کھولتا ہے۔ اس قانون میں ذات پات، رنگ، نسل اور ادوار کی کوئی قید نہیں۔ حضرت عیسیٰؑ نے اپنی امت سے فرمایا،
"مانگو تو تم کو دیا جائے گا۔ ڈھونڈو تو پاؤ گے۔ دروازہ کھٹکھٹاؤ تو تمہارے واسطے کھولا جائے گا کیوں کہ جو کوئی مانگتا ہے، اسے ملتا ہے اور جو ڈھونڈتا ہے، وہ پاتا ہے اور جو کھٹکھٹاتا ہے، اس کے واسطے کھولا جائے گا۔"
(انجیل۔ متی: باب ۷، آیت: ۷-۸)

لامحدود خلاؤں میں داخل ہونے کا راز لامحدود ہستی سے اپنے تعلق کو محسوس کرنے میں ہے۔

لاشعور سے واقف ہستیاں فرماتی ہیں کہ یہ دنیا غیر حقیقی ہے، حقیقت کسی اور عالم میں ہے جو مادی نگاہ سے اوجھل ہے۔ وہ مشاہدے کی بنا پر یہ بات کہتے ہیں کہ مٹی سے بننے والی کوئی شے ایک حالت میں نہیں رہتی ــــ مستقل تغیر پذیر ہے۔ متغیر شے کو حقیقی نہیں کہا جاسکتا۔

ہم کہتے ہیں کہ یہ بچہ ہے جب کہ وہ بچہ روز بڑھ رہا ہے۔ کچھ عرصے بعد ہم کہتے ہیں کہ یہ لڑکا ہے جب کہ اس کی ساخت ہر لمحہ تغیر سے گزر رہی ہے۔ چند سالوں بعد ہم کہتے ہیں کہ یہ نوجوان ہے، نوجوانی جوانی میں ڈھل رہی ہے، جوانی بڑھاپے کے روپ میں ظاہر ہو رہی ہے اور بڑھاپے کو زمین چھپالیتی ہے۔ عمر کے ادوار کہاں سے آرہے ہیں، کہاں جارہے ہیں؟ کوئی ہے جو اس کے بارے میں سوچتا ہے—؟

کیا آپ نے سوچا ہے کہ مٹی مسلسل تغیر سے گزرتی ہے لیکن مستقل طور پر غائب نہیں ہوتی، لاشمار اشکال اختیار کرکے پھر مٹی بن جاتی ہے؟

اہم نکتہ: مٹی کی دو طرزیں ہیں۔ مٹی ایک حیثیت میں مظاہرہ اور دوسری حیثیت میں بنیاد ہے۔ مظاہرے میں ردّوبدل ہوتا ہے لیکن بنیاد تبدیل نہیں ہوتی — مثال کے طور پر زمین پر مکانات تعمیر ہوتے ہیں۔ مکانات ٹوٹتے بنتے ہیں لیکن زمین اپنی جگہ موجود ہے۔

ہر وجود کی ایک مرکزیت ہے۔ آم مٹی سے پیدا ہوتا ہے، گھٹتا ہے، بڑھتا ہے، غائب ہوتا ہے مگر غائب نہیں ہوتا پھر مٹی بن جاتا ہے اور مٹی سے ایک بار پھر آم ظاہر ہوتا ہے۔ آم کی مرکزیت مٹی ہے۔

قدرت نے ہر مخلوق کی طرح مٹی کے اندر "جوہر" رکھا ہے جو مٹی کے وجود کو قائم رکھنے کے ساتھ اسے اپنی صفات کے اظہار کے لئے پلیٹ فارم (زمین) فراہم کرتا ہے۔

ریلوے اسٹیشن پر کچھ وقت گزاریں اور ریل گاڑیوں کا آنا جانا دیکھیں۔ پلیٹ فارم اپنی جگہ رہتا ہے، ایک ریل گاڑی آتی ہے اور ایک جاتی ہے۔ اگر پٹڑی اکھڑ جائے تو ریل گاڑی کا اس پر سے گزرنا موقوف ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر مٹی کی بنیاد تبدیل ہو گئی تو مٹی ختم ہو جائے گی اور اس سے منسلک کڑیاں ٹوٹ جائیں گی۔

مٹی کے فارمولے پر غور کریں تو یہ پانی سے بنتی ہے۔ پانی جم کر مفرد اور مرکب ذرّات کی شکل اختیار کرتا ہے۔ پانی کیا ہے؟ گیسوں کا مجموعہ ہے اور گیسیں تصورات ہیں۔ تصورات لہریں ہیں اور لہریں مادی سطح کی پہلی اور آخری اسٹیج ہیں۔ غور کیجئے — لہر کو لکیر تصور کیا جائے تو پہلی لہر یا لکیر سے محدودیت کی ابتدا ہوتی ہے

اور آخری لہر یا لکیر پر محدودیت غائب ہو جاتی ہے۔ لہروں کو دیکھنا لاشعور میں دیکھنا نہیں ہے، لہروں کو روشنی یا نور کی حالت میں دیکھنا لاشعور میں داخل ہونا ہے۔ روشنی یا نور مٹی، گیس، تصور اور لہر میں بھی ہے۔ کائنات کا سارا نظام نور کی بنیاد پر قائم ہے۔ آدمی کو جس سطح پر روشنی یا نور کا مشاہدہ ہو جائے، محدودیت کی دیواریں گر جاتی ہیں۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے،

"اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔"

(النور:۳۵)

مٹی، گیس، تصور اور لہریں خدوخال ہیں، ان سب کے ڈائی مینشن ہیں۔ مادی شعور کسی نہ کسی سطح پر ان کے ڈائی مینشن کو بیان کر لیتا ہے۔

ساخت کے اعتبار سے تمام آسمان اور ساری زمینیں الگ الگ ہیں لیکن ان میں شعور ایک ہے۔ غرض یہ ہے کہ ہر شے بدل جاتی ہے لیکن جس بنیاد پر وہ شے قائم ہے، نظام کے تسلسل کے لئے بنیاد تبدیل نہیں ہوتی۔

"سو تم اللہ کی سنت میں ہرگز تبدیلی نہ دیکھو گے اور اللہ کی سنت میں تعطل نہ پاؤ گے۔"

(فاطر: ۴۳)

خلا

مٹی کے دو رخ ہیں۔

۱۔ ایک رخ سڑاند اور تعفن ہے۔

۲۔ دوسرا رخ خلا ہے جس میں نور اور تخلیقی فارمولے ہیں۔

اول الذکر کی صفات منفی ہیں جب کہ خلا میں موجود نور سے واقف ہو کر بندہ مٹی کے منفی رخ سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

مٹی کو زمین میں پانی کے مشکیزے بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ پانی کو اپنے اندر جذب (محفوظ) کر لیتی ہے، معدنیات شامل کر کے توانائی میں اضافہ کرتی ہے اور پینے کے قابل بناتی ہے۔

قدرت نے مٹی کی ساخت اس طرح ترتیب دی ہے کہ یہ نرم ہے اور سخت بھی۔ جب مٹی میں بیج کی نشوونما ہوتی ہے تو یہ جڑوں کو گرفت قائم رکھنے کے لئے سہارا فراہم کرتی ہے۔ درخت، چھوٹی بڑی عمارتیں اور پہاڑ اس کے سہارے مضبوطی سے کھڑے ہوتے ہیں۔ اور جب مٹی کی گرفت ڈھیلی ہوتی ہے تو درخت، عمارتوں اور پہاڑوں کی جڑ اکھڑ جاتی ہے۔ مٹی زمین پر مخلوقات کی بنیاد ہے۔

نظیرؔ اکبر آبادی

جو خاک سے بنا ہے وہ آخر کو خاک ہے

دنیا میں کوئی شاد کوئی درد ناک ہے
یا خوش ہے یا الم کے سبب سینہ چاک ہے
ہر ایک دم سے جان کا ہر دم تپاک ہے
ناپاک تن پلید نجس یا کہ پاک ہے
جو خاک سے بنا ہے وہ آخر کو خاک ہے

ہے آدمی کی ذات کا اس جا بڑا ظہور
لے عرش تا بہ فرش چمکتا ہے جس کا نور
گزرے ہے ان کی قبر پہ جب وحش اور طیور
رو رو یہی کہے ہے ہر اک قبر کے حضور
جو خاک سے بنا ہے وہ آخر کو خاک ہے

کس کس طرح کے ہو گئے محبوب کج کلاہ
تن جن کے مثل پھول تھے اور منہ بھی رشک ماہ
جاتی ہے ان کی قبر پہ جس دم مری نگاہ
روتا ہوں جب تو میں یہی کہہ کہہ کے دل میں آہ
جو خاک سے بنا ہے وہ آخر کو خاک ہے

عمدوں کے تن کو تانبے کے صندوق میں دھرا
مفلس کا تن پڑا رہا ماٹی اپر پڑا
قائم یہاں یہ اور نہ ثابت وہ واں رہا
دونوں کو خاک کھا گئی یارو کہوں میں کیا
جو خاک سے بنا ہے وہ آخر کو خاک ہے

جتنا یہ خاک کا ہے طلسمات بن رہا
پھر خاک اس کو ہونا ہے یارو جدا جدا
ترکاری ساگ پات زہر امرت اور دوا
زر سیم کوڑی لعل زمرد اور ان سوا
جو خاک سے بنا ہے وہ آخر کو خاک ہے

گڑھ کوٹ توپ رہکلہ تیغ و کمان و تیر
باغ و چمن محل و مکانات دل پذیر
ہونا ہے سب کو آہ اسی خاک میں خمیر
میری زباں پہ اب تو یہی بات ہے نظیرؔ
جو خاک سے بنا ہے وہ آخر کو خاک ہے

پرندے مراقبہ کرتے ہیں

زندگی جذبات سے عبارت ہے اور جذبات حواس کے دوش پر سفر کرتے ہیں۔ پیاس لگتی ہے تو پیاس کے تقاضے کو پورا کرنے کے لئے حواس راہ نمائی کرتے ہیں کہ یہ پانی گرم ہے، یہ پانی سرد ہے، یہ پانی کڑوا ہے اور یہ پانی میٹھا ہے۔ پیاس کا تقاضا پانی پینے سے پورا ہوتا ہے۔ پانی کی پہچان حواس کے ذریعے ہوتی ہے۔ پیاس کی طرح بھوک بھی تقاضا ہے۔ ایک تقاضا کسی کو چاہنا ہے اور یہ خواہش کہ کوئی مجھے چاہے، الگ تقاضا ہے۔ ان تقاضوں کو ایک جگہ جمع کیا جائے تو اس کا نام زندگی ہے۔

تقاضوں کو الگ الگ دیکھنے اور سمجھنے کے لئے یہ بات مظہر بنتی ہے کہ مقداریں مختلف ہونے کی وجہ سے ہر تقاضا منفرد ہے۔ پیاس کے تقاضے میں جو مقداریں کام کرتی ہیں، وہ بھوک کے تقاضے میں موجود نہیں اس لئے پانی پینے سے بھوک رفع نہیں ہوتی اور بھوک میں کام کرنے والی مقداروں سے پیاس نہیں بجھتی۔

حواس ہر تقاضے کو جانتے اور سمجھتے ہیں۔ ایک تقاضا محبت ہے جس کے بغیر زندگی ادھوری ہے۔ حواس محبت کے تقاضے کو الگ الگ حیثیت دیتے ہیں جیسے عورت ہر حال میں عورت ہے، حواس اس کی شناخت کو الگ الگ کرکے بتاتے ہیں کہ یہ عورت ہماری بہن ہے، یہ بیٹی ہے اور یہ ماں ہے۔ یہی صورت مرد کی ہے۔ بحیثیت عورت و مرد سب میں قدریں مشترک ہیں لیکن مشترک قدروں میں بھی ضابطہ اور قانون ہے۔

انسانی زندگی جس بنیاد پر قائم ہے، اس کے دو ستون ہیں۔ ایک ستون جذبہ اور دوسرا ستون حواس ہیں۔ جب تک آدمی جذبات کے دائرے میں رہتا ہے، اس کی حیثیت دوسرے حیوانات سے الگ نہیں اور جب ان جذبات کو وہ انسانی حواس کے ذریعے سمجھتا ہے تو وہ حیوانات سے ممتاز ہو جاتا ہے۔ تقاضے مخلوقات میں یکساں ہیں۔ فرق یہ ہے کہ آدمی تقاضوں کی حیثیت

سے واقف ہے۔ یہ وقوف اسے اشرف المخلوقات کے درجے پر فائز کرتا ہے۔ حواس کے قانون سے واقف ہونا روحانی سفر کی ابتدا ہے۔

آدمی کے اندر بارہ کھرب کَل پرزوں سے بنی مشین کام کرتی ہے۔ کچھ کَل پرزے ایسے ہیں جو حواس بناتے ہیں، کچھ کَل پرزے ایسے ہیں جو جذبات کی تخلیق کرتے ہیں۔ نوعِ آدم کو اللہ نے یہ علم عطا کیا ہے کہ وہ جان سکتا ہے کہ اس کے اندر نصب مشین میں یہ کَل پرزے کس طرح فٹ ہیں اور ان کے ذریعے جذبات اور حواس کس طرح بنتے ہیں۔

جذبات اور حواس کے اعتبار سے آدمی اور تمام حیوانات ایک صف میں کھڑے ہیں لیکن ہاتھی، شیر، بکری، شہباز وغیرہ میں یہ صلاحیت نہیں کہ وہ حواس بنانے کی مشین یا حواس بنانے کے کَل پرزوں کو سمجھ سکیں۔ اگر آدمی اپنے اندر نصب کائناتی نظام کو نہیں سمجھتا تو اس کی حیثیت بلّی، کتّے اور ہاتھی سے زیادہ نہیں اس لئے کہ بھوک پیاس بلّی کو بھی لگتی ہے اور آدمی کو بھی۔ خوشی اور غم کے جذبات ہاتھی کے اندر بھی ہیں اور آدمی بھی غم و خوشی میں ردّوبدل ہوتا ہے۔

آدمی اولاد کی پرورش اور تربیت کرتا ہے، چڑیا بھی اپنے بچوں سے محبت کرتی ہیں اور ضروری باتوں سے آگاہ کرکے ان کی تربیت کرتی ہے۔

حضور قلندر بابا اولیاؒ کا فرمان ہے،

”پرندے اور حیوانات ابتدائی رات میں سوتے ہیں پھر مراقبہ میں چلے جاتے ہیں اور صبح صادق تک مراقب رہتے ہیں۔“

مشاہدہ ہے کہ صبح سویرے چڑیاں ایک جگہ جمع ہوتی ہیں اور — اجتماعی طور پر چوں چوں کرتی ہیں —عبادت کرتی ہیں۔

”کیا تم دیکھتے نہیں ہو اللہ کی تسبیح کر رہے ہیں وہ سب جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور وہ پرندے جو پر پھیلائے اڑ رہے ہیں، ہر ایک اپنی نماز اور تسبیح کا طریقہ جانتا ہے۔“ (النور:۴۱)

روحانی نقطۂ نظر سے اگر کوئی آدمی سب کام وہی کرتا ہے جو بلّی کرتی ہے تو اس کی حیثیت بلّی کے برابر ہے۔ نوعِ آدم بلّی اور چوہے سے اس لئے افضل ہے کہ خالقِ کائنات اللہ تعالیٰ نے اسے اندر میں نصب مشین یا کمپیوٹر کا علم سکھایا ہے۔ اگر وہ اس علم کو حاصل نہیں کرتا تو بتایئے اس کی حیثیت اور مقام کیا ہے—؟

The Secret of a Beautiful Smile

DENTAL innovations Clinic

Dental Implants

Aesthetic Dentistry

Teeth Whitening, Porcelain Crowns, Veneers, Ceramic Restorations

Restorative Dentistry

Crown & Bridge, Root Canal Treatment

Orthodontics

Fixed And Removable Braces, Invisible Braces

General Dentistry

Extractions, Fillings, Dentures

Preventive Dentistry

Pit Fissure Sealants, Scaling, Root Planning

Minor Oral Surgery

Impaction (Wisdom Teeth), Apicectomy

Pediatric Dentistry

Space Maintainers, Steel Crowns

LAHORE

LG 136, Siddiq Trade Center
Main Boulevard Gulberg.
0301 2399991 - 042 2581711
0300 8511747

QUETTA

Balochistan Medical Center
Prince Road / Fatima Jinnah Road,
081 2836448 - 081 2825275
0300 3811747

FL 5 & 6, Block B, Gulshan-e-Jamal
Rashid Minhas Road, Karachi.
f: lavishdinerestaurant
Lavish Dine
Restaurant
www.lavishdinerestaurant.com
- Party up to 400 Persons
- Affordable Party Menus
- Buffet
- À la carte
Ph: 021-34570423
Cell: 0333-3538004

تیک نات ھان

دریا کی کہانی

یہ ویت نام سے تعلق رکھنے والے دانشور تیک نات ھان کی تحریر کا ترجمہ ہے۔

پہاڑ سے ظاہر ہونے والا ننھا چشمہ رقص کرتا ہوا اترتا ہے اور پہاڑ کی دہلیز پار کرکے بہتا ہوا کہیں دور نکل کر ندی بن جاتا ہے۔ ندی گنگناتے ہوئے آگے بڑھتی ہے، ساز و آواز کے ردہم سے پانی کی رفتار میں اضافہ ہوتا ہے۔ ندی دوڑنا چاہتی ہے اور شاید اڑنا بھی۔ وہ کہیں پہنچنا چاہتی ہے۔ اسے کہاں جانا ہے—؟ سمندر میں۔ اس نے گہرے نیلے سمندر کا ذکر سنا ہے۔ وہ سمندر سے مل کر ایک ہونا چاہتی ہے۔

میدانی علاقے میں داخل ہوکر ندی پر شباب آتا ہے اور وہ دریا بن جاتی ہے۔ اب کوئی اسے ندی نہیں کہتا جب کہ ندی اور چشمہ دونوں دریا کے اندر چھپے ہوئے ہیں۔ دریا کو سبزہ زاروں سے گزرتے ہوئے کہیں سمٹنا پڑتا ہے اور کہیں رفتار دھیمی کرنی پڑتی ہے۔

دریا سوچتا ہے کہ جب میں ندی تھا تو تیزی سے بہتا تھا۔ اب دریا ہوں اور چٹیل میدانوں کو سیراب کرتے ہوئے گزر رہا ہوں پھر وہ رفتار کیوں نہیں—؟ ندی کی تیزی جو میری پہچان تھی، کہاں گئی—؟ مجھے گہرے نیلے سمندر تک پہنچنا ہے۔ اگر رفتار یہ رہی تو وقت کی چادر پھیل جائے گی۔ منزل کب آئے گی؟

جب دریا ندی تھا، اپنے حال سے خوش تھا نہ رفتار سے مطمئن — وہ دریا کی تیز موجوں کا خواہاں تھا۔ اب قدرت نے دریا بنا دیا ہے پھر بھی ناخوش ہے اور عجلت میں رہتا ہے۔ کہتا ہے کہ میں سست رفتاری کا متحمل نہیں ہوسکتا۔

دریا جوان ہے، چٹیل میدانوں سے گزرتے ہوئے جب رفتار دھیمی ہوتی ہے تو اسے اپنے پانی میں خوب صورت بادلوں کا عکس نظر آتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ بادل کے رنگ مختلف اور

اشکال متفرق ہیں، یہ آزاد ہیں، جہاں چاہتے ہیں تیرتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔

تیز رفتاری اور آزادی کے شوق میں دریا کے دل میں بادل بننے کی تمنا پیدا ہوتی ہے۔ وہ زمین پر بہتے ہوئے، فضا میں تیرنے والے ایک کے بعد ایک بادل کا پیچھا کرتا ہے۔

کہتا ہے ـــ اے بادل! میں دریا بننے پر خوش نہیں، تم جیسا بننا ہے۔ اگر دریا رہا تو عمر تکلیف میں گزرے گی اور زندگی آزار بن جائے گی۔

آسمان پر بادلوں کے تعاقب میں زمین پر بہنے والا دریا نشیب و فراز سے گزرتا ہے، ہنستا ہے، روتا ہے مگر رکتا نہیں کہ اپنے مقام اور ماہیت سے نکلنے کی آرزو ہے۔ جب کوشش رنگ نہیں لاتی تو ایک جواز دستک دیتا ہے۔ دریا کہتا ہے کہ بادل دیر تک نہیں ٹھہرتے، میرے پانی میں اپنا عکس منعکس کرکے چلے جاتے ہیں۔ ان میں وفا نہیں۔ مجھے ان سے تسکین پہنچتی ہے نہ خوشی۔ بے وفائی ناقابلِ قبول ہے۔ ان کا پیچھا کرنے کی کوشش میں مصائب کیوں برداشت کروں؟

دوپہر کو تیز ہوا آتی ہے اور سارے بادلوں کو ساتھ لے جاتی ہے۔ ان کے جاتے ہی مطلع صاف ہو جاتا ہے۔ اب وہاں کوئی بادل نہیں کہ دریا جس کا پیچھا کرے۔ فضا بادلوں سے خالی ہوتے ہی دریا کے جذبات میں ویرانی پیدا ہو جاتی ہے اور جینے کی خواہش نہیں رہتی۔ وہ سوچتا ہے کہ کچھ ہونے سے کچھ نہ ہونا کیا اتنا آسان ہے ـــ ؟

دریا جوان ہے، بادل کی رفاقت چھوٹتی ہے تو تنہائی کے غم میں ڈوب کر رات کو خود میں سمٹ جاتا ہے مگر نیند نہیں آتی۔ اندر میں اضطراب کناروں سے ٹکرا کر نوحہ کناں ہے۔ آہ و فریاد میں ڈوبی آواز سے ہر شے بے آواز ہو گئی ہے۔

یہ پہلا موقع ہے جب دریا گہری یکسوئی سے اپنی آواز سنتا ہے اور ایسا کرتے ہوئے اس پر انکشاف ہوتا ہے ـــ میرا پانی بادلوں سے بنا ہے، میں بادلوں کا پیچھا کر رہا ہوں یہ جانے بغیر کہ میں اپنی فطرت میں خود بادل ہوں۔

دریا کو احساس ہوتا ہے کہ گوہرِ نایاب جس کی تلاش میں بے قرار ہو کر کوہساروں، وادیوں اور میدانوں سے گزر رہا ہوں، اندر میں ہے۔

دریا میں سکون اتر جاتا ہے۔

رفتار دھیمی ـــ بہت دھیمی ہو جاتی ہے۔

چشمے سے ندی اور ندی سے دریا بنتے ہوئے اب خود سے باہر کسی کا پیچھا کرنے کی ضرورت

محسوس نہیں ہوتی کیوں کہ وہ تو پہلے سے وہی ہے جو وہ بننا چاہتا ہے۔ آگہی سکون کی چادر بن جاتی ہے جسے اوڑھ کر دریا گہری نیند سو جاتا ہے۔

صبح جب دریا نیند سے جاگتا ہے تو اپنے اندر حیرت انگیز عکس نظر آتا ہے — یہ نیلا آسمان ہے۔ گہرا، لامحدود اور سکون سے بھرپور۔ آسمان بے نیاز، متوازن اور آزاد ہے۔ دریا کی نظر پہلی مرتبہ اپنے اندر آسمان کے عکس کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس سے پہلے اس کی دلچسپی بادلوں تک محدود تھی۔

دریا نے سوچا کہ بادل فضا میں غائب ہو جاتا ہے لیکن فضا کو چھوڑ نہیں سکتا کہ اس کا مسکن زمین و آسمان کے درمیان خلا ہے۔ بادل میں پانی آسمان سے آتا ہے۔ بادل فضا میں موجود ہیں مگر نظروں سے اوجھل ہیں۔ یہ پانی کے مشکیزے ہیں۔ یقیناً سارے بادل اور سارا پانی آسمان میں ہے — بادل غیر مستقل معلوم ہوتے ہیں لیکن آسمان اپنی جگہ رہ کر بادلوں سے وفا کرتا ہے۔

اندر میں آسمان کے عکس کو چھوتے ہی دریا میں ٹھہراؤ آجاتا ہے۔ قرار کے لئے مقام مل جاتا ہے۔ وہ اصل کو چھولیتا ہے۔ ماضی میں اس نے صرف بادلوں کے آنے جانے اور ہونے نہ ہونے کو محسوس کیا۔ یہ نہیں سوچا کہ اس سے برسنے والے پانی میں آسمان کا عکس موجود ہے اور یہ عکس پانی سے الگ نہیں ہو سکتا۔

ہر شے کسی بنیاد پر ظاہر ہوتی ہے — ظاہر ہو کر غائب ہو جاتی ہے مگر بنیاد اپنی جگہ رہتی ہے۔ دریا سرشار ہے کہ اسے بنیاد مل گئی ہے۔

وہ اندر میں اپنے مقام پر واپس آ گیا ہے۔

جس دیس جانا ہے، وہاں پہنچ چکا ہے۔

دوپہر کو ہوا کے ٹھہرتے ہی بادل ایک ایک کر کے واپس آتے ہیں۔ دریا نے غیب ظاہر غیب کی حقیقت جان لی ہے، وہ مسکراتے ہوئے بادلوں کا استقبال کرتا ہے۔ بادلوں کا رنگ اور شکل وہی ہے مگر ان کو دیکھنے والی نظر اب اور ہے۔ دریا کے دل میں بادل کے تعاقب کی خواہش نہیں ابھرتی۔ وہ ان پر مسکراہٹوں کے پھول نچھاور کرتا ہے۔ بادل آتے ہیں اور تیرتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ یہ امر خوش آئند ہے کہ ان کے جانے سے دریا کو اندر میں خلا محسوس نہیں ہوتا۔ یوں تغیر کے بندھن سے آزاد اور آزادی کی نعمت سے سرشار دن تمام ہوتا ہے۔

رات کو ہر خوف سے آزاد دریا آسمان کی طرف

دیکھتا ہے تو پانی میں حسین عکس جھلملاتا ہوا نظر آتا ہے۔ بہت روشن، لطیف اور مسکراتا ہوا۔ یہ چودھویں کا چاند ہے۔ دریا نے دیکھا کہ زمین و آسمان کے درمیان خلا میں جو کچھ ہے، سب چاند کی ضوفشانی سے سرشار ہیں۔ دریا چوں کہ دوسروں کی طرح بننے کی خواہش سے بے نیاز ہوگیا ہے، وہ اچھے میزبان کی طرح چاند کے عکس کو قبول کرتا ہے۔ بے نیازی کے وصف سے کسی شے کو اپنے اندر اسپیس فراہم کرکے اس احساس کو تقویت ملتی ہے کہ اس کا ذہن کھونے اور پانے کے خوف سے آزاد ہوگیا ہے۔

ہر شے اپنی ذات میں دریا ہے—اگر دریا اپنے حال میں خوش ہے تو پانی پر منعکس ہونے والی اشیا کا عکس صاف نظر آتا ہے اور زمین و آسمان کے درمیان دوری کی نفی کرکے خوب صورتی سے جھلملاتا ہے۔

فضا چاندنی کے سحر میں ڈوبی ہوئی ہے۔ چاند، ستارے، پانی اور آسمان پر مستی و بے خودی طاری ہے۔ سب شاداں و فرحاں ہیں اور سہانی رات میں زندگی کا سفر طے کررہے ہیں۔ ان کی رفتار متوازن اور مدہم ہے—کسی کو کہیں پہنچنے کی

> براعظم افریقا میں موجود دریائے کانگو دنیا کا سب سے گہرا دریا ہے۔ بعض مقامات پر اس کی گہرائی 720 فٹ (220 میٹر) بتائی جاتی ہے۔ یہ لگ بھگ 4700 کلومیٹر طویل ہے اور طوالت کے لحاظ سے دنیا کا دسواں بڑا دریا ہے۔

جلدی نہیں کیوں کہ ہر ایک کا اپنا سمندر ہے جو باہر نہیں، ان کے اندر ہے۔

دریا نے جان لیا ہے کہ یہ کیف تب حاصل ہوتا ہے جب فرد لمحۂ موجود میں خوش رہنا سیکھے۔ دریا کو سمندر بننے کے لئے سمندر تک پہنچنے کی ضرورت نہیں۔ وہ لامحدودیت سے وقوف کے لئے وسیع سمندر میں داخل ہونے کا پابند نہیں۔ وہ سمندر سے نکلا ہے یعنی سمندر اس کے اندر ہے۔ دونوں کی فطرت پانی ہے۔ بادل، چاند، آسمان، ستارے اور برف کا عکس بھی اندر میں بنتا ہے یعنی یہ سب دریا کے اندر موجود ہیں پھر وہ کچھ اور بننے کی جستجو کیوں کرے؟

اپنی ماہیت چھوڑ کر دوسری ماہیت کے پیچھے بھاگنا سراب ہے۔ دریا کو اپنی رفتار ترک کرکے کسی اور کی رفتار اختیار کرنے کی ضرورت نہیں کہ یہاں جو کچھ ہے، اس کے اندر ہے۔

آسیہ روبی

سبق آموز

یہ کہانی ندیم کی ہے مگر شروع اللہ رکھی سے ہوتی ہے اور ختم بھی اللہ رکھی پر ہوئی ہے۔

اللہ رکھی نے خالی برتن میں چند سنگ ریزے ڈالے۔ برتن بڑا تھا جسے اٹھاتے ہی سنگ ریزے ہلے اور پُرسکون ماحول میں ہلچل ہوگئی۔ وہ جہاں جہاں سے برتن اٹھاتے گزری، آواز نے ہر کسی کو چونک کر دیکھنے پر مجبور کر دیا۔

اف! سنگ ریزوں کی وجہ سے کتنی خفّت اٹھانی پڑ رہی ہے۔ جب تک گھر نہیں پہنچتی، شور بپا رہے گا اور ہر کوئی میری طرف دیکھے گا۔

قدموں کی رفتار تیز کی تو سنگ ریزوں کا شور دوچند ہو گیا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی سکون کا سانس لیا۔ ابا صحن میں بیٹھے تھے۔ بیٹی کا سرخ چہرہ دیکھ کر مسکرا دیئے۔

اس نے چارپائی پر برتن رکھتے ہوئے کہا، خالی برتن میں پتھر ڈالو تو شور مچاتے ہیں اور اگر برتن بھر دو تو بوجھ اٹھانا مشکل ہو جاتا ہے۔

ابا نے کہا، اچھا نہیں کہ برتن خالی رکھا جائے؟

دوپٹے سے پیشانی کا پسینہ پونچھ کر پانی کے مٹکے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے بے نیازی سے کہا، ابا! برتن خالی رکھنا مشکل ہے۔ کیوں نا برتن ہی توڑ دیا جائے۔

ندیم نے انٹر کے امتحانات دیئے تھے جب کمانے کی ذمہ داری کندھوں پر آپڑی تھی۔ وہ دس بہن بھائی تھے۔ ابا کی کمائی سے کنبے کے اخراجات پورے ہونا مشکل تھا۔ سب سے چھوٹی بہن کی پیدائش کے بعد اماں نے بستر پکڑ لیا۔ نہ جانے کیسی بیماری تھی جو وقت سے پہلے ادھ موا کر گئی۔ اس کا خیال تھا کہ میں یہاں رہ کر جتنی تگ و دو کرلوں، ابا سے زیادہ نہیں کما سکتا۔ اس نے ملک سے باہر جانے کا فیصلہ کیا۔

ابا کو ترکے میں بڑا گھر ملا تھا۔ اس سے ملحق زمین تھی جس پر کھیتی باڑی ہوتی تھی۔ زمین بیچ

کر ویزا اور ٹکٹ کے پیسوں کا بندوبست ہوا اور وہ پردیس چلا گیا۔

پتر دیکھ! تمہاری خاطر خاندانی زمین بیچی ہے۔ جتنا تعاون ہم کر سکتے تھے، وہ کیا۔ زمین صرف تمہاری نہیں تھی، سب بہن بھائیوں کا حق تھا۔ تم ان کے پیسوں پر باہر جارہے ہو۔ ماں بیمار ہے، بہنوں نے کم عمری میں گھر سنبھال لیا ہے۔ ان کو بہن بھائی کی جگہ اولاد سمجھنا، اللہ تمہیں بہت نوازے گا۔

ابا! بے فکر رہیں، آپ کا بازو بن کر سب کا حق ادا کروں گا۔ تسلی دے کر رخصت ہو گیا۔

ندیم نے پردیس میں سخت محنت کی۔ پیچھے اماں چپ چاپ ایک دنیا سے دوسری دنیا میں چلی گئیں۔ ڈاکٹر کہتے تھے کہ انہیں کینسر تھا۔ وقت گزرا تو ابا نے بڑی بیٹی ساجدہ کی شادی طے کر دی۔ وہ وقت پر بچوں کی ذمہ داری پوری کرنا چاہتے تھے۔ گھر سنبھالنے کے لئے ساجدہ کی جگہ کسی کا ہونا ضروری تھا۔ ندیم کا رشتہ طے ہو چکا تھا مگر وہ ابھی واپس نہیں آسکتا تھا۔ ابا نے ندیم سے پہلے چھوٹے بیٹے ماجد کی شادی کر دی۔

سال دو سال بعد ندیم کی بھی شادی ہو گئی۔ ماجد کو دوسرے شہر میں نوکری ملی، وہ بیوی کو لے کر منتقل ہو گیا۔ تین بھائی اور چار بہنیں رہتی تھیں۔ ابا سادگی سے بچوں کا گھر بساتے گئے۔ اتنے میں باقی بھائی بھی باہر چلے گئے۔

ابا نے نصیحت کی تھی کہ جتنا کماؤ، بڑے بھائی کے ہاتھ میں دینا، وہ باپ کی جگہ ہے۔ چھوٹے بھائیوں نے باپ کا بھرم رکھا لیکن ندیم کی نیت میں فتور آ گیا اور بھائیوں کا پیسہ ہاتھ میں آنے سے وہ کام میں سست پڑ گیا۔ سوچا کہ میں جو کر سکتا تھا، کر لیا، اب ان کی باری ہے۔ وطن واپس آ کر اپنی اور بھائیوں کی جمع شدہ رقم سے دو منزلہ گھر تعمیر کیا۔

وقت ایک سا نہیں رہتا۔ تینوں بھائی واپس آ گئے۔ کسی کو کاروبار میں گھاٹا ہوا اور کسی کا ویزہ نہیں لگا۔ سب شادی شدہ تھے، گھر میں جھگڑے شروع ہو گئے، بھائیوں کی بیویوں نے ایک گھر میں رہنے سے انکار کر دیا۔ ابا نے کسی طرح صلح صفائی کروا کر سب کا چولہا الگ کیا۔ جیتے جی گھر کا بٹوارا کیسے کرتے! جب تک حیات رہے، گھر میں سکون تھا لیکن ان کی آنکھیں بند ہوتے ہی بھائی بھائی دشمن ہو گئے۔

ابا نے چھوٹی عمر میں کمانے بھیج دیا۔ اگر میں نہ کماتا تو آج تم اتنے لائق نہ ہوتے۔ جتنا ایثار میں نے کیا ہے، اس حساب سے اس گھر میں تم لوگوں کا حق نہیں، بہتر ہو گا اپنا بندوبست کرو۔

ندیم بھائی! اگر آپ نے کما کر بھیجا ہے تو یہ مت بھولیں کہ جن پیسوں سے آپ باہر گئے، اس کے لئے خاندانی زمین فروخت کی گئی جس میں ہم سب کا حصہ تھا۔ ہم نے آپ کی عزت کی، جو کمایا آپ کے ہاتھ پر رکھا، خود کمانے کے قابل ہوئے تو بہنوں کی شادی میں مدد کی۔ میں نے کہا تھا کہ اتنے پیسے جمع ہو چکے ہیں کہ سب کا الگ الگ گھر بن سکتا ہے لیکن آپ نہیں مانے۔ مجھے کاروبار میں نقصان ہوا تو آپ نے مدد نہیں کی حالاں کہ میری رقم آپ کے پاس جمع تھی۔ ہم واپس آکر اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی کوشش کر رہے ہیں اور آپ ہیں کہ گھر سے نکلنے کا کہہ کر ہمارے پیروں سے زمین نکال رہے ہیں؟ راشد روہانسا ہو گیا۔

ندیم سنی ان سنی کرتے ہوئے بولا، کس نے کہا تھا کہ باہر جا کر عیاشی کرو؟ کاروبار کرنا نہیں آتا تھا تو ملازمت جاری رکھتے۔ اگر میں یہاں سے رقم بھجواتا تو وہ بھی ڈوب جاتی۔

بحث ہاتھاپائی تک پہنچ گئی۔

آواز گھر سے باہر گئی، گاؤں والوں کو جھگڑے کا علم ہوا۔ کسی نے ندیم کی طرف داری کی اور کسی نے باقی بھائیوں کی۔ بہنوں کی کوشش تھی کہ کسی طرح یہ قضیہ نمٹ جائے مگر ندیم نے گھر میں کسی کا حصہ تسلیم نہیں کیا۔

چاچا رشید نے ندیم کو بلوایا۔ وہ ابا کے پرانے دوست تھے۔ پتر! تو بڑا ہے، باپ کی جگہ ہے، کیا باپ اولاد کا حق مارتا ہے؟ تو نے ان کا خیال رکھا تو انہوں نے بھی تیری مدد کی۔ جیسے اولاد کو جائیداد میں حصہ دیتے ہیں، خوش اسلوبی سے ان کا حصہ دے۔ کیوں اپنے سر گناہ لیتا ہے؟

بزرگو! کہنا آسان اور سہنا مشکل ہے۔ ان کی وجہ سے میں بیوی بچوں سے دور رہا۔ اب یہ میری عزت کرتے ہیں نہ اس کی۔ ماں کی جگہ ہے وہ ان کی لیکن ان کی بیویوں کی زبانیں دیکھیں، قینچی کی طرح چلتی ہیں۔

پتر! تو ایثار کی قیمت چاہتا ہے۔ اگر تیرے بھائی اپنے حق سے دستبردار ہو جائیں تو تیرے نزدیک یہ اپنے ایثار کی قیمت ہے۔ بہت سستا سودا کیا ہے۔ کیا تو خود کو ان کا بھائی کہہ سکے گا؟ یہ دعویٰ کر سکے گا کہ بڑا بھائی باپ کی جگہ ہوتا

ہے؟ تونے نیکی نہیں، کاروبار کیا ہے اور کاروبار میں منافع دیکھا جاتا ہے۔ جب اللہ کی خاطر کچھ کیا جائے تو وہ معاملہ اللہ اور بندے کا ہے۔ دل بڑا کر۔ رشتوں میں کاروبار کرنے والے کم ظرف ہوتے ہیں۔ چاچا نے بہت سمجھایا لیکن ندیم کا دل پتھر بن گیا تھا۔

ندیم کے گھر میں مصیبتوں کے راستے کھل گئے۔ کبھی بیوی بیمار تو کبھی کسی بچے کے ساتھ کوئی مسئلہ۔ بیوی کی بیماری نے طول پکڑا، علاج پر کثیر رقم خرچ ہوئی۔ اخراجات اتنے بڑھ گئے کہ موجودہ آمدنی میں گزارہ ممکن نہ تھا۔ واپس جانا چاہا تو ٹکٹ کے پیسے نہ تھے۔ پردیس میں اپنے دوست دانش سے مدد مانگی جس نے ٹکٹ دینے کے ساتھ ملازمت کی بھی پیشکش کی۔

ندیم نے پردیس جاکر دوست کی دکان پر ملازمت کی۔ ابتدا میں معاملات ٹھیک رہے پھر دانش نے ہر آئے گئے کے سامنے احسان جتانا شروع کردیا، کبھی دوستوں کے حلقے میں، کبھی دعوتوں میں کہتا تھا کہ اللہ نے مجھے دینے والا بنایا ہے، جہاں موقع ملتا ہے، میں ایثار سے دریغ نہیں کرتا، ندیم کو ہی دیکھ لو۔ اچھی نوکری چھوڑ کر واپس گیا، وہاں گھر بنایا پھر جمع پونجی اڑادی۔ خالی ہاتھ ہونے پر اس کو میرا خیال آیا، میں نے پس و پیش سے کام لئے بغیر اللہ کی رضا کے لئے ٹکٹ کے پیسے دیئے اور ملازمت بھی۔

ندیم کو آئے دن خفّت اٹھانی پڑتی۔

ڈھکے چھپے لفظوں میں دانش کو ایسا کرنے سے روکتا لیکن وہ ہنسی مذاق میں بات اڑادیتا۔

تین مہینے بعد دانش نے تنخواہ روک لی کہ ہاتھ تنگ ہے، کچھ دن رک جاؤ۔

ہاتھ کیسے تنگ ہے، دکان پر تو بہت کام ہے۔ میں نے اوور ٹائم کیا ہے۔ وہ جھجکتے ہوئے بولا۔

اچھا کل لے لینا۔ دانش نے بے دلی سے کہا۔

بمشکل تنخواہ ملی جو فوراً گھر بھجوائی۔

ہر مہینے تنخواہ کے وقت یہی ہونے لگا۔ دانش کا اصل روپ سامنے آگیا تھا۔ تنخواہ مانگنے پر وہ ٹال مٹول سے کام لے کر کہتا کہ تم میرے حالات سے واقف ہو مگر احساس نہیں کرتے۔ مشکل وقت میں تمہارا ساتھ دیا، اپنے ٹکٹ پر بلوایا۔ غرض احسانات کی داستان سناتا۔

ایک روز دانش نے اس کی تذلیل کی جس پر ندیم نے کہا، بس دوست! بہت ہوگیا، تمہارا

قرض ادا کر چکا ہوں، ٹکٹ کے پیسے لوٹا دیئے ہیں اور چھٹی کے بعد بھی دکان پر بلا معاوضہ کام کرتا ہوں۔ پیچھے بیوی بچے میرا انتظار کر رہے ہیں اور تم جان بوجھ کر میرا حق روک لیتے ہو۔ سب کے سامنے تذلیل کرتے ہو اور خود کو حاتم طائی سمجھتے ہو۔ تم مفاد پرست ہو۔

دانش غصے سے لال پیلا ہوگیا۔ مفاد پرست میں نہیں، تم ہو۔ مشکل وقت میں کی گئی مدد کی قیمت کبھی ادا نہیں ہوتی۔ میری دکان سے پیسے کما کر مجھے مفاد پرست کہتے ہو؟ تم اس ملک میں میری وجہ سے ہو۔ شکر نہیں کرتے کہ دو وقت کی روٹی مل رہی ہے۔ رہی بات احسان جتانے کی تو کیا میں نے مدد نہیں کی؟ اس میں جھوٹ کیا ہے؟ میں نے کوئی فلاحی ادارہ نہیں کھولا جہاں تم جیسوں کو مفت کھلاؤں۔

ندیم غصے میں دکان سے باہر آ گیا۔ اس لمحے ماضی نے دستک دی۔ اپنے بھائی یاد آئے۔ وہ سلوک یاد آیا جو بھائیوں سے کیا تھا۔ دانش اور اس کے رویے میں کیا فرق تھا؟ اس نے بھائیوں کا حق مارا اور انہیں معاشی طور پر برباد کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور خود بھی محفوظ نہ رہا۔

پردیس میں تنہائی کی وجہ سے سوچنے کا بہت وقت ملتا ہے۔ اپنے اور دوسروں کے رویوں پر غور کرنے کا موقع بھی ملتا ہے۔

زندگی دوبارہ اسی نقطے پر لوٹ آئی جہاں سے چلی تھی۔ وہ پردیس میں مزید رکنا نہیں چاہتا تھا۔ صحت اور ہمت بھی پہلے جیسی نہ تھی۔

چاچا رشید کی بات مان کر بھائی اپنے حق سے دستبردار ہو گئے تھے۔ کرائے کے گھر میں رہتے تھے۔ ایک نے گھر میں دکان کھول لی، دوسرے نے چھوٹا کاروبار شروع کیا۔ دو سال بعد ندیم لوٹا تو دیکھا کہ دونوں بھائیوں نے کسی قدر خود کو سنبھال لیا تھا۔ صفر سے شروع کرنے کی باری اب ندیم کی تھی۔ اسے خود پر افسوس تھا۔

ایک شام چاچا رشید کے پاس بیٹھا تھا۔

وہ کہنے لگے، آدمی نادان ہے۔ جب کسی کی خاطر کچھ کرتا ہے تو صلے میں بہت کچھ حاصل کرنے کی چاہ رکھتا ہے۔ جس پر احسان کیا اور جس کے ساتھ نیکی کی، اسے غلام سمجھ لیتا ہے اور بات بے بات احسان جتا کر دل آزاری کرتا ہے۔ بڑے کہتے ہیں — نیکی کر، دریا میں ڈال۔ صحیح کہتے ہیں۔ جو آدمی نیکی کو دریا میں نہیں ڈالتا، وہ اس سے کاروبار شروع کر دیتا ہے۔ بھئی! نیکی

کا خیال دل میں کس نے ڈالا؟ بندے کی کیا مجال کہ کسی کا اچھا سوچے؟ نیکی کا خیال اللہ کی طرف سے رحمت ہے جس کے لئے وہ ہمارا انتخاب کرتا ہے۔ جب یہ سوچ لیا جائے کہ نیکی کرنے کی توفیق رب نے دی ہے اور اس کا صلہ بھی رب دے گا تو سارے مسئلے حل ہو جائیں گے۔

اللہ رکھی پاس بیٹھی سن رہی تھی۔ وہ کچھ دیر پہلے برتن میں سنگ ریزے لئے گھر لوٹی تھی۔

وہ اپنے ابا چاچا رشید کی بات سن کر بولی، کیا کریں ابا! برتن خالی رکھنا بڑا مشکل ہے۔ کیوں بھائی ندیم! تو کیا کہتا ہے؟

ندیم کچھ نہیں سمجھا تو چاچا بولے، سچ کہتی ہے اللہ رکھی، کم ظرفوں کے لئے برتن خالی رکھنا مشکل ہے۔ جب کسی کے لئے کچھ کرتے ہیں تو ایک سنگ ریزہ اٹھا کر برتن میں ڈال لیتے ہیں۔ برتن میں جیسے ہی کچھ جاتا ہے، برتن شور مچانے لگتا ہے۔ آدمی بے خبری میں برتن سنگ ریزوں سے بھر لیتا ہے پھر اس بوجھ کو اٹھائے پھرتا ہے یہاں تک کہ تھک ہار کر بیٹھ جاتا ہے۔

اللہ رکھی سنگ ریزوں سے کھیلتی ہوئی بولی، ابا! کیوں نا برتن ہی توڑ دیا جائے۔

ہاں دھی! تو ٹھیک کہتی ہے۔ برتن توڑ دینا چاہئے تا کہ "میرا تیرا" کا قصہ تمام ہو۔

باپ بیٹی کی گفتگو جاری تھی۔

ندیم پچھتاوے میں مبتلا سوچ رہا تھا کہ کاش! میں نے بھی برتن توڑا ہوتا تو آج اس حال میں نہ ہوتا۔ آنکھوں میں ندامت کے آنسو تھے۔

جواب

ایک مفلس آدمی کی اپنے پرانے دوست سے ملاقات ہوئی جو روحانیت سے واقف ہو چکا تھا۔ اس نے مفلسی کا رونا رویا تو روحانی دوست نے سڑک کنارے پڑی ہوئی اینٹ کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ اینٹ سونا بن گئی۔ سونے کی اینٹ مفلس شخص کو دی تو وہ مطمئن نہ ہوا۔

دوست نے اینٹ سے سونے کا شیر بنا کر دیا پھر بھی تسلی نہیں ہوئی۔

اور کیا چاہتے ہو—؟ روحانی دوست نے پوچھا۔ مفلس دوست نے جواب دیا، تمہاری انگلی۔

قارئین! آپ کیا سمجھے—؟ جو کچھ سمجھے اور نہیں سمجھے، لکھ کر بھیج دیجئے۔

اظہر حسین

بوڑھے طوطے

سیکھنے کا تعلق وقت اور دلچسپی سے ہے ورنہ آدمی جوانی میں بھی کچھ نہیں سیکھتا۔

بوڑھے طوطے بھی کہیں پڑھتے ہیں؟

یہ اردو زبان کا محاورہ ہے جس کا مطلب ہے کہ آدمی جب بوڑھا ہوجاتا ہے تو اس کے لئے سیکھنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔

اگر بڑی عمر کے لوگوں کو کسی علم، خاص طور پر ٹیکنالوجی کے بارے میں بتایا جائے تو اکثریت سیکھنے سے گریز کرتی ہے اور کہتی ہے کہ بوڑھے طوطے بھی کبھی سیکھتے ہیں؟

ہم نے دواؤں کے بارے میں بوڑھے افراد کی گفتگو سنی۔ وہ ایک دوسرے کو بڑھاپے میں ہونے والی مختلف بیماریوں کی دواؤں کے نام اور فوائد بتا رہے تھے۔ یہ سن کر بوڑھے طوطے کا محاورہ ذہن میں گونجا اور خیال آیا کہ اگر بڑھاپے میں سیکھنا بہت مشکل ہے تو یہ افراد دواؤں کے بارے میں معلومات اور اپنی دلچسپی کے امور کس طرح یاد رکھتے ہیں؟

سیکھنے کا انحصار یادداشت پر ہے۔ شطرنج کی سینکڑوں چالوں میں اس وقت کون سی چال چلنی ہے، اس کا تعلق یادداشت اور معاملہ فہمی سے ہے۔ اسی طرح سرجری کے دوران کہاں دباؤ کم یا زیادہ رکھنا ہے، نشتر کے نیچے کوئی اہم رگ تو نہیں، یہ باتیں بھی یادداشت، معاملہ فہمی، تجربہ اور حاضر دماغی سے متعلق ہیں۔

زبان سیکھنے کے لئے الفاظ یاد کئے جاتے ہیں اور بوقتِ ضرورت یعنی معاملہ فہمی کی مناسبت سے الفاظ کا استعمال ہوتا ہے۔ الفاظ کی ترتیب اور جملے کی ساخت کو گرامر کہتے ہیں۔ مادری زبان سیکھتے ہوئے گرامر کے قواعد یاد نہیں کئے جاتے، یہ لوگوں کی دیکھا دیکھی ازبر ہوجاتے ہیں جیسے پانی پلانا۔

۱۔ پانی پلانا اچھا عمل ہے۔

۲۔ زید مسافروں کو پانی پلاتا ہے۔

دونوں جملوں میں پانی پلانے کا مطلب الگ ہے۔ پہلے جملے میں پانی پلانے کی اہمیت بتائی گئی ہے اور دوسرے جملے میں پانی پلانے کا عمل ہے۔ دونوں جملے اردو کے ہیں لیکن معاملے کی مناسبت سے استعمال مختلف ہے۔

الفاظ یاد ہونا اور ان کا موزوں استعمال علم ہے۔ مثلاً ڈاکٹر نے ماں سے کہا کہ بچے کے پیٹ میں گیس یا مروڑ ہے، مرہم زرد کی مالش کریں۔ اس جملے میں دوا کا نام ہے اور استعمال بھی۔ ڈاکٹر دونوں کا علم حاصل کرتا ہے اور ان کی معلومات مریض کو بھی دیتا ہے۔

سیکھنے کے عمل کی عمر سے کیا نسبت ہے، اس کی مثال مصر سے تعلق رکھنے والی 87 سالہ خاتون زبیدہ عبد العلال ہیں۔ زبیدہ کے والد لڑکیوں کی پڑھائی کے خلاف تھے لیکن بیٹی کا تعلیم کے حصول کا شوق ختم نہ کر سکے۔ ان کو تعلیم حاصل کرنے کا موقع بڑھاپے میں ملا۔ وہ دادی بن گئی ہیں، ان کے پوتا پوتی ہیں۔ انہوں نے اسکول میں داخلہ لیا ہے اور ذوق و شوق سے پڑھتی ہیں۔ زبیدہ عبدالعلال ان لوگوں کے لئے مثال ہیں جو بڑھاپے میں پڑھائی کو مشکل سمجھتے ہیں۔

دماغ دو کام مسلسل کرتا ہے۔

۱۔ حواس کے ذریعے معلومات کا حصول

۲۔ جسم کو احکامات جاری کرنا

دونوں افعال اعصابی نظام کے تحت عمل میں آتے ہیں اور تیز رفتاری سے انجام پاتے ہیں۔

حواس اس تیزی سے کام کرتے ہیں کہ پیر میں کسی چیز کے چبھنے کی اطلاع دماغ کو لمحے سے کم وقت میں موصول ہو جاتی ہے۔ دماغ اطلاع کا جائزہ لے کر جسم کو تعمیل کا حکم دیتا ہے یا اطلاع کو یادداشت کا حصہ بنالیتا ہے۔

تحقیق و تلاش کے مطابق دماغ میں نیوران نامی خلیے ہیں۔ ان خلیوں کے درمیان تعلق کا نام یادداشت ہے۔ دماغ جب کچھ سیکھتا ہے تو یہ عمل دو یا زائد نیوران کے درمیان تعلق قائم ہونے کی وجہ سے ہے۔

تصور: شاخ جس مقام پر درخت سے جڑی ہوئی ہے، اسے نیوران تصور کریں۔ شاخ خود نیوران کے ہاتھ یعنی ایگزان (axon) ہیں۔ جہاں شاخ ختم ہوتی ہے، وہ ایگزان کے اختتامی حصے ہیں۔ اگر درخت کی دو شاخوں کے اختتامی حصے خاص فاصلے تک قریب آجائیں تو دونوں شاخوں کے درمیان تعلق قائم ہوتا ہے جس کو

یادداشت یا سیکھنا کہتے ہیں۔

دماغ میں اربوں اعصابی خلیے ہیں جو یادداشت کے شماریات سے زیادہ ریکارڈ ہیں۔ ماہرین کہتے ہیں کہ بچہ پیدا ہوتا ہے تو اعصابی خلیوں میں تعلقات اتنے زیادہ نہیں ہوتے۔ جیسے جیسے بچہ سیکھتا ہے، خلیوں سے شاخیں نکل کر باہمی تعلق کے عمل کو مضبوط بناتی ہیں۔ صفحے پر اعصابی خلیات کے اس عمل کی تصویر دیکھئے۔

بچہ اسکول کی ابتدائی کلاسوں میں 100 تک گنتی، اردو اور انگریزی حروفِ تہجی لکھنا اور ملانا، چند کلمے، درود شریف اور نظمیں سیکھتا ہے اور اس میں دو تین سال لگ جاتے ہیں۔ تحقیق و تلاش (سائنس) کے مطابق ہر نئی بات سیکھنے کے لئے اعصابی خلیے میں سے ایک نیا ایگزان نکلتا ہے اور اگلے خلیے تک جاتا ہے۔ ایگزان کے نکلنے اور آگے تک جانے کی کوشش کو ماہرین "یاد کرنا" کہتے ہیں۔

بچے کو چند ایک الفاظ سیکھنے میں دو تین سال لگتے ہیں، اس دوران وہ ہفتے میں پانچ دن وقت کی پابندی کے ساتھ اسکول جاتا ہے پھر گھر پر اماں ابا اور بڑے بہن بھائی پڑھاتے ہیں یا ٹیوشن

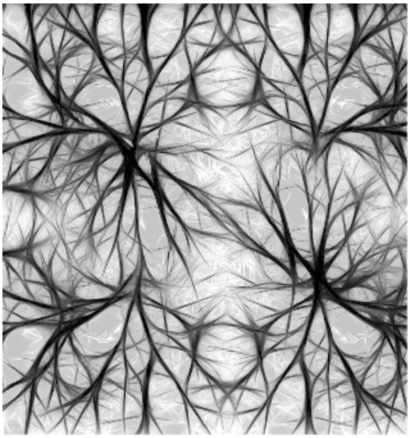

کا انتظام ہوتا ہے۔ بچے کے دماغ کو ہم خالی سلیٹ کہتے ہیں جس پر چند باتیں لکھنے میں دو تین سال لگ جاتے ہیں۔ بچہ اگلی کلاسوں میں جاتا ہے تو ہر سال زیادہ سیکھتا اور یاد رکھتا ہے۔

کراچی بورڈ کی دسویں جماعت کی اردو کی کتاب میں 30 اسباق ہیں جن میں آٹھ نظمیں، سات غزلیں اور باقی نثر ہے۔ یہ صرف ایک مضمون "اردو" کی بات ہے جب کہ دسویں جماعت میں چھ مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔

بچہ جس نے دو تین سال میں چند الفاظ لکھنے پڑھنے سیکھے، وہ دسویں جماعت کی چھ کتابیں ایک سال میں پڑھ لیتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جتنا پڑھا جاتا ہے، اس سے پڑھنے، لکھنے، سمجھنے اور سیکھنے کی صلاحیت میں اضافہ ہوتا ہے۔

یہی بچہ بڑھاپے میں داخل ہوتا ہے تو عموماً تعلیمی سرگرمیوں سے دور ہوجاتا ہے اس لئے جب کوئی نئی ٹیکنالوجی یا زبان سیکھنے کی بات آتی ہے تو وہ گھبرا جاتا ہے کیوں کہ عام طور پر اس عمر میں علم سیکھنے کی طرف رجحان نہیں ہوتا۔

یہ درست نہیں ہے کہ بڑھاپے میں علم سیکھنا مشکل ہے۔ آدمی پوری زندگی سیکھنے کے عمل سے گزرتا ہے۔ اگر بڑی عمر میں سیکھنا مشکل ہوتا تو دادا دادی، نانا نانی کے لئے پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کے نام اور پسند ناپسند یاد رکھنا ممکن نہ ہوتا۔ جن کے بچے ملک سے باہر ہیں، وہ واٹس ایپ* کا استعمال سیکھ لیتے ہیں۔

سیکھنا دلچسپی پر منحصر ہے۔ جتنی دلچسپی ہوتی ہے، سیکھنا آسان ہوجاتا ہے۔ عمر کوئی بھی ہو، سیکھنے کے لئے ذہن کا خالی ہونا ضروری ہے۔ تعلیم کے بعد شادی ہوتی ہے اور شادی کے بعد بچے ہوتے ہیں تو ذہن بہت سے معاملات میں مصروف ہوجاتا ہے۔ اب ایسے شخص سے کہیں کہ فلاں چیز سیکھو تو وہ معذرت کرلیتا ہے کیوں کہ اس کا ذہن کئی معاملات میں تقسیم ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ علم سیکھنے میں اس کی دلچسپی نہیں۔ اگر دلچسپی ہو تو وہ ہزار مصروفیات اور سنگین مسائل کے باوجود اپنی پسند کا کام کرنے کے لئے وقت نکال لیتا ہے۔

سیکھنے کے عمل سے دماغ کے زیادہ سے زیادہ خلیے فعال ہوتے ہیں، ان میں ربط بڑھتا ہے۔ ماہرین کہتے ہیں کہ جو لوگ کچھ نہ کچھ سیکھتے رہتے ہیں، ان میں عمر بڑھنے کے ساتھ بھولنے کی بیماری (الزائمر۔ Alzheimer) میں مبتلا ہونے کے امکانات کم سے کم ہوجاتے ہیں۔

سیکھنے کے عمل اور الزائمر کے درمیان نسبت کی وضاحت کرتے ہوئے ایک محقق نے کہا ہے کہ جس جنگل میں درخت اور جھاڑیاں کم ہوں، وہ آسانی سے کٹ جاتا ہے مگر گھنے جنگل کو کاٹنے میں وقت لگتا ہے۔

الزائمر یعنی بھولنے کی بیماری جب حملہ آور ہوتی ہے تو جن لوگوں کے دماغی خلیات فعال ہوتے ہیں، ہر دو خلیوں کی شاخوں میں تعلق قائم ہوتا ہے، ان پر الزائمر دیر سے اثر انداز ہوتا ہے یا نہیں ہوتا۔ سیدھا سادہ فارمولا ہے کہ ہم جو چیز استعمال کرتے ہیں، اس کی صلاحیتیں

* واٹس ایپ (انٹرنیٹ کی دنیا میں سماجی رابطے اور فوری پیغامات کی ترسیل کا ایک پلیٹ فارم)

نمایاں ہوتی ہیں اور باقی چیزیں بھول کے خانے میں چلی جاتی ہیں۔

سیکھنا مشقت طلب ہے۔ بعض لوگ متحرک نہ ہونے کی وجہ سے سیکھنے میں سستی کرتے ہیں اور الزام بڑھاپے کے سر جاتا ہے حالاں کہ بڑھاپا کسی کو سیکھنے سے نہیں روکتا۔ بہت سے بوڑھے افراد خود کو مصروف رکھنے کے لئے کسی سرگرمی میں مشغول رہتے ہیں اور جس کام میں دلچسپی لیتے ہیں، اسے جلدی سیکھ لیتے ہیں کیوں کہ ان کے پاس زندگی کا تجربہ ہے۔

ذہانت اور حافظہ تیز کرنے کا فارمولا:

الہامی کتابوں اور آخری آسمانی کتاب قرآن کریم کی کم سے کم ایک آیت کو مع ترجمہ اور تفکر کے ساتھ پڑھیں تو 12 مہینوں میں 365 آیات معنی و مفہوم کے ساتھ یاد ہو جاتی ہیں اور ذہن 365 دنوں میں وہ فریکوئنسی قبول کر لیتا ہے جو انوار جذب کرنے کے لئے درکار ہے۔ الہامی کتابوں کو سمجھ کر پڑھنے اور غور و فکر سے فہم تیز ہوتی ہے۔

آپ اچھی کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیں اور دن میں دس صفحے پڑھیں تو 30 دن میں ایک کتاب پوری ہو جاتی ہے۔ غرضیکہ سیکھنے کا عمل کسی بھی عمر میں جاری رہ سکتا ہے، بات دلچسپی کی ہے۔

اگر معاشرے کا عمومی رویہ حوصلہ افزائی کی بجائے حوصلہ شکنی کا ہو تو اس طرح کے محاورے وجود میں آتے ہیں۔

قارئین کرام ! مضمون پڑھنے کے بعد بھی اگر آپ کا شمار ان لوگوں میں ہے جو سمجھتے ہیں کہ بوڑھے طوطے کا محاورہ درست ہے تو پھر ''جوان طوطوں'' کے بارے میں کیا خیال ہے؟

انسانیت

انسان دیگر مخلوقات سے اس لئے ممتاز ہے کہ وہ تخلیقی فارمولوں کا علم حاصل کر کے تصرف کر سکتا ہے۔ اگر نوعِ آدم کا کوئی فرد روحانی صلاحیتوں سے واقف نہ ہو تو چاہے وہ کتنا بڑا محقق کیوں نہ بن جائے ــــ اس کی حیثیت سوالیہ نشان ہے۔

دنیاوی علم حاصل کریں، اس سے صلاحیتوں میں اضافہ ہوتا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ روحانی علوم بھی سیکھیں تاکہ اندر میں روحانی صلاحیتیں بیدار ہوں اور آپ زمین میں اپنے منصب ''انسانیت'' سے واقف ہو جائیں۔

عظیمی

روغن گلوسبز

پُرسکون نیند لاتا ہے

سر کے جملہ امراض اور

ہائی بلڈ پریشر میں مفید ہے

چاند کی کرنیں جذب کر کے تیار کیا جاتا ہے

قرۃ العین واسطی

پریم پیالہ اساں ہنس رس پیتا
جو کچھ کیتا سانوں تیرے نیناں کیتا

"غیبت چوری سے بڑا گناہ ہے کیوں کہ چوری میں چور کوئی چیز عارضی طور پر حاصل کرلیتا ہے لیکن غیبت میں ہاتھ کچھ نہیں آتا بلکہ غیبت کرنے والے کے اعمال خاکستر ہو جاتے ہیں۔"

خلافت ملنے کے ایک عرصے بعد خواجہ نور محمد مہارویؒ کو ان کے مرشد حضرت فخر الدین اورنگ زیب آبادیؒ نے حکم دیا،

"کوہستانِ سلیمان کی چوٹیوں پر ایک شہباز بلند پرواز ہے جس کی تربیت کی جائے تو اس کی پرواز بہت اونچی ہوگی۔ جاؤ اور اس گوہرِ مقصود کو لے کر آؤ۔"

خواجہ نور محمدؒ نے اپنی ذمہ داریوں کے ساتھ شہباز کی تلاش جاری رکھی۔ کئی برس گزر گئے لیکن گوہرِ نایاب نہ ملا۔ تدریس کی غرض سے وہ اکثر مختلف علاقوں کا دورہ کرتے تھے۔ ایک مرتبہ اوچ شریف آئے تو کوٹ مٹھن میں مقیم ان کے ایک مرید میاں حسن علی اپنے مکتب کے شاگردوں کو لے کر حاضر ہوئے۔

مجلسِ معرفت جاری تھی کہ ایک 16 سال کا نوجوان جو مکتب میں بے باکی کی وجہ سے مشہور تھا، نے سوال پوچھنے کی اجازت چاہی۔ اس نے سنا تھا کہ خواجہ صاحبؒ سرود شوق سے سنتے ہیں، وہ اس حوالے سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔

انہوں نے فرمایا، کیا پوچھنا ہے؟

یہ سنتے ہی نوجوان شاگرد کی قوتِ گویائی جیسے سلب ہوگئی اور ذہن ماؤف ہوگیا۔

خواجہ محمد مہارویؒ نے فرمایا، ادھر آؤ، تمہاری جستجو نے تو مجھے تھکا دیا۔

پیر و مرشد کی زبان سے یہ الفاظ سن کر سب کو حیرت ہوئی۔ اتنے میں میاں حسن علی نے عرض کیا کہ حضور! یہ بے باک نوجوان ہے، ابھی اسے گفتگو کا سلیقہ نہیں آتا۔

فرمایا، یہ ہمارا اور نوجوان کا معاملہ ہے۔

اتنے میں حیرت میں گم نوجوان قریب آیا تو

آپ نے فرمایا، تم ہی میرے شہباز ہو۔

اس نوجوان کا نام محمد سلیمان تھا، دنیا جن کو خواجہ سلیمان تونسویؒ کے نام سے جانتی ہے۔

حضرت سلیمان تونسویؒ گیارہویں صدی کے اواخر میں کوہِ درگ (صوبہ بلوچستان) میں پیدا ہوئے جو تونسہ سے مغرب کی سمت میں کچھ فاصلے پر ہے۔ شیرخواری کے دور میں تھے کہ والد کا انتقال ہوگیا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد تونسہ گئے اور میاں حسن علی کے مکتب میں داخلہ لیا۔ اس مکتب کے ذریعے ان کی ملاقات خواجہ نور مہارویؒ سے ہوئی اور تربیت کا سلسلہ شروع ہوا۔

خواجہ سلیمان تونسویؒ صحن میں خوش الحانی کے ساتھ دیوانِ حافظ پڑھ رہے تھے کہ خواجہ نور محمدؒ تشریف لے آئے۔

وہ مرشد کے ادب میں خاموش ہوگئے۔

میاں سلیمان! کیا پڑھ رہے تھے؟ مرشد نے مشفقانہ لہجے میں پوچھا۔ انہوں نے حافظ شیرازی کا شعر پڑھا جس کا ترجمہ یہ ہے،

"مشاطہ کے فن کا کمال یہ ہے کہ وہ بدصورت کو بھی خوب صورت بنادیتی ہے۔"

جواب میں مرشد نے یہ شعر پڑھا۔ ترجمہ،

"یہ مت کہہ کہ تو بوڑھا ہوگیا ہے اور تیرا ذوقِ عشق باقی نہیں رہا۔ تجھے کیا خبر کہ ہماری پرانی شراب کچھ اور ہی مستی رکھتی ہے۔"

خواجہ سلیمانؒ تقریباً چھ سال مرشد کی خدمت میں رہے جس کے بعد خلافت سے سرفراز ہوئے اور تونسہ میں قیام کا حکم ملا۔

وقت گزرا ـــ عقیدت مندوں کا سلسلہ بڑھا اور پھر وہ وقت آیا جب خواجہ سلیمانؒ نے تونسہ کو دارالعلوم بنایا جہاں دور دراز سے طالب علم آئے اور فیض حاصل کیا۔ اس کے ساتھ لنگر خانہ قائم کیا جسے چلانے کے لئے ایک پورا محکمہ تشکیل دیا۔ خواص و عوام میں ان کی مقبولیت اس قدر تھی کہ سرسید احمد خان نے اپنی کتاب "آثار الصنادید" میں تحریر کیا ہے،

"خواجہ سلیمان تونسویؒ کی شہرت قاف سے قاف تک ہے۔"

ایک صاحب حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میں نے دوسرے شہر میں سکونت اختیار کی، وہاں باجرہ کاشت کیا مگر دانہ خشک ہوگیا۔

انہوں نے فرمایا، آدمی شام چلا جائے یا روم، جو کچھ اس کی قسمت میں ہے، اس میں کمی بیشی

نہیں۔ اللہ نے اس کے لئے جو مقدر فرمادیا ہے، وہ جہاں جائے گا، اسے پہنچ جائے گا۔

ایک عام اور خاص شخص میں کیا فرق ہے، خواجہ سلیمانؒ نے سادہ الفاظ میں خوب صورتی سے بیان کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں،

"جو شخص اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے رزق پر قناعت کرتا ہے، اس کے دل میں زیادتی کی طلب اور حرص نہیں ہوتی، ایسا شخص خواص میں سے ہوتا ہے اور جس کا حال اس کے برعکس ہو، وہ عوام میں سے ہوتا ہے۔"

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے کتنی محبت کرتے ہیں، خواجہ سلیمان تونسویؒ نے عقیدت مندوں کو اس حوالے سے ذیل میں تحریر واقعہ سنایا۔

حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں خشک سالی ہوگئی۔ قوم نے ان سے بارش کے لئے دعا کی درخواست کی۔ انہوں نے دعا کی تو وحی ہوئی،

"فلاں جگہ ضعیف بڑھیا سکونت پذیر ہے۔ اس کی گھاس پھونس کی کُٹیا پرانی ہوچکی ہے۔ اگر بارش برسے گی تو وہ تباہ وبرباد ہو جائے گی، اس وجہ سے ہم نے بارش روک رکھی ہے۔"

حضرت موسیٰؑ کے حکم پر لوگوں نے بوڑھی خاتون کی مدد کی جس کے بعد خوب بارش ہوئی۔

خواجہ سلیمانؒ نے حاضرین سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ہر کام میں کوئی حکمت ہوتی ہے لیکن ہماری ناقص عقل یہ بات نہیں سمجھتی۔

ایک دولت مند شخص نے درخواست کی کہ یا تو آپ مجھے موسیٰ بنادیں یا فرعون۔

خواجہ سلیمانؒ خاموش رہے۔

دوسری تیسری مرتبہ یہ بات دہرائی تو انہوں نے فرمایا، تم نے کہا کہ تمہیں موسیٰ بنادیا جائے یا فرعون۔ جہاں تک موسیٰؑ کا تعلق ہے تو وہ اللہ کے نبیوں میں سے تھے اور نبوت حضرت محمدؐ پر ختم ہوگئی ہے اس لئے تمہارا موسیٰ بننا ممکن نہیں ہاں البتہ فرعون بننا چاہتے ہو تو بن سکتے ہو۔

وہ شرمندہ ہوکر معافی کا طلب گار ہوا۔

انہوں نے دعائے خیر فرمائی اور نصیحت کی کہ آئندہ ایسی خواہش نہ کرنا۔ اللہ نے تم پر کرم کیا ہے۔ اگر تم فرعون بنادیئے جاتے تو تمہاری دنیا اور آخرت دونوں برباد ہو جاتیں۔

خواجہ سلیمان تونسویؒ فرماتے تھے کہ اللہ اپنے بندوں کے گناہوں سے درگزر فرماتے ہیں جب کہ آدمی کا عمل یہ ہے کہ وہ کسی میں عیب دیکھتا ہے تو اس کی تذلیل کرتا ہے اور عیب کو جگہ جگہ

ظاہر کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ پردہ پوشی فرماتے ہیں۔ آدمی کو بھی چاہئے کہ عیب پوشی کرے تا کہ اس کے اپنے عیب ظاہر نہ ہوں۔

نوعِ آدم کا کوئی فرد جب اپنے روحانی تشخص سے واقف ہو جاتا ہے تو آدمیوں کے علاوہ دیگر مخلوقات بھی اس کی عقیدت مند بن جاتی ہیں۔

ایک شخص بیوی کے ہمراہ حاضر ہوا اور بتایا کہ اس پر جن کا سایہ ہے۔ خواجہ صاحبؒ نے جن سے پوچھا، خاتون کو کیوں گرفتار کیا ہے؟

جن نے عرض کیا، چند روز سے میرا بچہ سخت بیمار ہے۔ میں حاضر ہو کر بیماری سے نجات کا تعویذ حاصل کرنا چاہتا تھا مگر کوئی صورت نظر نہ آئی اس لئے میں نے یہ طریقہ اختیار کیا۔

انہوں نے فرمایا، خاتون کو چھوڑ دو۔ یہ بتاؤ کہ تعویذ کس طرح حاصل کرو گے؟

جن نے عرض کیا، فلاں جگہ پتھر کے نیچے رکھ دیجئے، وہاں سے اٹھالوں گا۔

اس طرح دونوں کا مسئلہ حل ہوا۔

خواجہ سلیمان تونسویؒ کو موسیقی سے شغف تھا۔ کسی قوال سے کوئی عمدہ شعر سنتے تو رقّت طاری ہو جاتی۔ ایک قوال نے یہ شعر پڑھا،

پریم پیالہ اساں ہنس رس پیتا
جو کچھ کیتا سانوں تیرے نیناں کیتا

ترجمہ: عشق کا پیالہ ہم نے ہنستے ہوئے پیا۔ ہم پر جو گزری، تیرے نینوں کے سبب گزری۔

انہوں نے شعر سنا تو آنکھیں بھیگ گئیں اور دیر تک رقّت طاری رہی۔

افغانستان کا حکمران شجاع الملک اقتدار سے محروم ہو گیا اور علاقہ چھوڑ دیا۔ کچھ عرصے بعد لشکر تیار کیا اور واپس کابل کی طرف بڑھا۔ اس نے خواجہ سلیمان تونسویؒ کا ذکر سنا تھا، دعا کے لئے حاضر ہوا اور زوال کا قصہ بھی سنایا۔

خواجہ صاحبؒ نے پوچھا، شجاع الملک! کس کی پناہ میں جا رہے ہو؟ اس نے دو سرداروں کے نام لئے جنہوں نے اسے حمایت کا یقین دلایا تھا۔

خواجہ صاحبؒ نے سوال تین مرتبہ دہرایا۔

اس نے ہر بار ایک ہی جواب دیا۔

فرمایا— اللہ بے نیاز ہے، وہ جسے چاہتا ہے، سرفراز کرتا ہے۔ پھر شجاع الملک کو اشاروں کنایوں میں خبردار بھی کیا لیکن وہ نہیں سمجھا۔

اس کے جانے کے بعد فرمایا،

"شجاع الملک کی تقدیر کی گردش دور نہیں ہوئی اور مستقبل میں بھی کوئی آثار نظر نہیں آتے کیوں کہ شجاع الملک کو اللہ کی بجائے اپنے دوحامی سرداروں پر بھروسا ہے۔"

شجاع الملک لشکرکشی کے دوران مارا گیا۔

خواجہ سلیمان تونسویؒ کے دور میں جغرافیائی حالات ابتر تھے۔ اخلاقی انحطاط سے نکلنے کے لئے اخلاق کی درستی پر زور دیا۔

وہ اپنے خطبات میں فرماتے تھے،

"خاتم النبیین حضور اکرمؐ کی اتباع کے بغیر آدمی میں اچھے خواص پیدا نہیں ہوتے۔"

ان کا ایک قول ہے کہ دنیا میں بے شمار آدمی ہیں لیکن آدمیت کم ہے۔ انہوں نے معرفت کا ایک نکتہ بیان کرتے ہوئے فرمایا،

"لوگوں کو خواہ ان کا عمل کیسا ہو، شفقت و رحمت کی نظر سے دیکھو۔ اللہ ایسے بندوں پر رحم فرماتا ہے۔"

اخلاقی انحطاط میں غیبت کا بنیادی کردار ہے۔ اس سے خلوص ختم ہوجاتا ہے اور بے حسی پیدا ہوتی ہے۔ غیبت سے ہونے والے نقصان کے بارے میں انہوں نے فرمایا،

"یادرکھو! غیبت چوری سے بڑا گناہ ہے کیوں کہ چوری میں چور کوئی چیز عارضی طور پر حاصل کرلیتا ہے لیکن غیبت میں ہاتھ کچھ نہیں آتا بلکہ غیبت کرنے والے کے اعمال خاکستر ہوجاتے ہیں۔"

تکبر اور حسد میں مبتلا لوگوں کے متعلق فرمایا،

"جس دل میں حسد اور کبر کے کانٹے ہوتے ہیں، اس میں توحید کا پھول نہیں اگتا۔"

خواجہ سلیمان تونسویؒ اپنے پیر و مرشد خواجہ محمد مہارویؒ کی ایک بات اکثر دہراتے تھے،

"جو شخص اپنے مرشد کے ارشادات پوری توجہ سے سنتا ہے اور ان کو لکھ لیتا ہے، وہ صاحبِ فیض ہوتا ہے۔"

روایت ہے کہ محمد واصل نامی ایک سیاح حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں نے بہت سیاحت کی ہے مگر آپ جیسے سخی کم دیکھے ہیں۔ آپ لوگوں کی مدد کرتے ہیں، ان کو اونٹ اور گھوڑے دیتے ہیں، اناج اور لباس فراہم کرتے ہیں، بیماروں کو دوائیں مہیا کرتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ لوگوں کو فلاح کا راستہ دکھاتے ہیں۔

سیاح کی گفتگو سن کر مسکرا دیئے۔ فرمایا،

"میاں واصل! میری بات دھیان سے سنو۔ جب میں حصولِ علم کے لئے اپنے گھر سے نکلا اور دوسرے علاقے میں سکونت اختیار کی تو ایک شخص نے میرے دو وقت کے کھانے کا انتظام کیا۔ میں روزانہ کھانا لینے اس کے گھر جاتا تھا۔ اس کا ایک کتا تھا جو دروازے پر بیٹھا رہتا تھا۔ مجھے اس سے ڈر لگتا تھا۔ جب کتّا دروازے پر نہ ہوتا تو میں دوڑ کر اندر جاتا اور کھانا لے آتا ورنہ دن فاقے میں گزرتا۔"

یہ فرما کر وہ خاموش ہو گئے۔

حاضرینِ مجلس پر سکوت طاری تھا۔

مختصر وقفے کے بعد فرمایا،

"میاں واصل! میں سلیمان ہوں جسے ایک وقت کی روٹی کے لئے انتظار کرنا پڑتا تھا۔ کہاں کی داد و دہش اور کیسی سخاوت؟ یہ اللہ کا کرم ہے کہ مجھے رحمتوں سے نواز دیا۔"

اللہ کے دوست، خاتم النبیینؐ کی سیرتِ طیبہ کی پیروی کرتے ہیں۔ حضرت سلیمان تونسویؒ گفتگو میں اکثر اس بات کو دہراتے تھے،

"خاتم النبیین رحمۃ للعالمین حضرت محمدؐ کی پیروی کرنا ہم درویشوں کی زندگی ہے۔ اگر تمہیں کوئی شخص ہوا میں اڑتا نظر آئے مگر اس کا کوئی فعل خلافِ سنت ہو تو ہرگز اس کی پیروی نہ کرنا کیوں کہ عبادات کی معراج اور تکمیل رسول اللہؐ کی سنت کی ادائیگی سے ہوتی ہے۔ اللہ کی رضا اس وقت حاصل ہوتی ہے جب اس کے حبیب حضرت محمدؐ کی سنت پر عمل کیا جاتا ہے۔"

اللہ کے نیک بندوں کی طرح حضرت سلیمان تونسویؒ کی زندگی پتھریلی زمینوں کی آبیاری کرنے اور ان میں نرمی و گداز کا بیج بونے میں گزری۔ ان کا وصال ہوا تو روح نے عالمِ بالا میں پرواز کی جب کہ ان کا جسمِ خاکی تونسہ شریف میں آسودۂ خاک ہے۔

روایت ہے کہ حضرت سلیمان تونسویؒ وصال سے پہلے یہ شعر کثرت سے پڑھتے تھے،

اگر گیتی سراسر باد گیرد
چراغ مقبولاں ہرگز نمیرد

مفہوم: اگر زمین پر ہوا کا طوفان آجائے، تب بھی اللہ کے کرم سے ان لوگوں کا چراغ نہیں بجھے گا جو مقبولِ بارگاہِ خداوندی ہیں۔

خالدہ زبیر

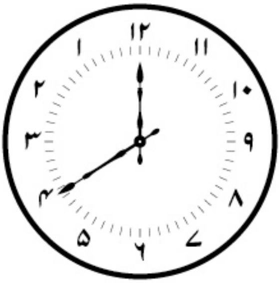

ایتھلیٹ اینٹی کلاک وائز سمت میں دوڑتا ہے تو اس کی برقی مقناطیسی لہریں، زمین کی مقناطیسی لہروں کو قبول کرتی ہیں جس سے ایتھلیٹ کے دوڑنے کی رفتار میں تیزی آجاتی ہے۔

پہاڑ سطحِ زمین پر جتنا بلند نظر آتا ہے، زیر زمین اس سے زیادہ گہرائی ہے ـــ سمندر کی سطح جتنی وسیع ہے، اندر اس سے کئی گنا عمیق ہے۔ باریک بینی سے دیکھیں تو معنوی اعتبار سے ہر تخلیق کی یہی حقیقت ہے۔

شہد کی مکھی چھوٹا سا حشرہ ہے۔ اس حشرے کے اندر رنگ و روشنی کی فیکٹری ہے جس میں بننے والا شہد برسوں خراب نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ دلچسپ ہے۔ شہد کی مکھی رب کی ہموار کی ہوئی راہوں پر چلتی ہے ـــ لاشعوری تحریکات پر عمل کرتی ہے۔

تخلیقی علوم سے واقف ہستیاں فرماتی ہیں کہ لاشعور میں ہر شے کی حرکت گھڑی کی مخالف سمت (اینٹی کلاک وائز) ہے۔ اس سمت میں رفتار تیز ہوتی ہے جب کہ کلاک وائز موومنٹ میں رفتار کم ہوتی ہے۔ کلائی پر بندھی یا دیوار پر ٹنگی گھڑی کو دیکھئے۔ تمام سوئیاں اسپیس در اسپیس آگے بڑھتی ہیں۔ سیکنڈ کی سوئی ایک منٹ کے سفر کے لئے 60 قدم چلتی ہے جس سے رفتار کم اور فاصلہ طویل محسوس ہوتا ہے۔

اینٹی کلاک وائز موومنٹ میں بھی فاصلہ اتنا ہی ہے جتنا کلاک وائز میں ہے مگر سفر ریورس ہونے کی وجہ سے، جس اسپیس کی طوالت کو ہم نے قبول کیا تھا، اس کی نفی ہو جاتی ہے۔ اسپیس ہوتی ہے مگر نفی ہونے سے محسوس نہیں ہوتی۔ نتیجے میں رفتار تیز ہو جاتی ہے۔

اولمپکس کے میدانوں میں مقابلے کے لئے دوڑنے کی سمت اینٹی کلاک وائز رکھی جاتی ہے۔ اس سے ایتھلیٹ کے قدموں میں ایک خاص

روانی آتی ہے یہاں تک کہ دوڑنے والے کو محسوس ہوتا ہے کہ میں نہیں دوڑ رہا، زمین دوڑا رہی ہے۔اس کی وجہ کیا ہے؟

بشمول زمین ہر شے کی باطنی گردش اینٹی کلاک وائز ہے۔ تحقیق و تلاش (سائنس) نے زمین کے ایک دن کا سفر تقریباً 25 ہزار میل قیاس کیا ہے۔ قارئین اندازہ کرسکتے ہیں کہ پھر زمین کی باطنی گردش کس قدر تیز ہوگی۔

ہر شے کے گرد برقی مقناطیسی میدان* ہے۔ ایتھلیٹ اینٹی کلاک وائز سمت میں دوڑتا ہے تو اس کی برقی مقناطیسی لہریں، زمین کی مقناطیسی لہروں کو قبول کرتی ہیں جس سے ایتھلیٹ کے دوڑنے کی رفتار تیز ہوجاتی ہے تاہم لہروں کی قبولیت کسی ایتھلیٹ کی ذہنی و جسمانی سکت کے مطابق ہوتی ہے۔ غور طلب ہے کہ اگر زمین کی رفتار سے مکمل ہم آہنگی ہوگئی تو فرد کا مٹی سے بنا جسم غائب ہوجائے گا کیوں کہ مٹی میں ایسی کسی توانائی کو برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں اس لئے ہر فرد ذہنی و جسمانی سکت کے مطابق زمین کی باطنی رفتار کو قبول کرتا ہے۔

راقم الحروف کا ذاتی تجربہ ہے کہ کلاک وائز سمت میں دوڑنے سے پیر جلدی تھکتے ہیں لیکن اینٹی کلاک وائز سمت میں دوڑنے سے ایسا نہیں ہوتا۔ ایتھلیٹ تھکتا ضرور ہے مگر دیر سے۔

تھکن کا تعلق اسپیس، جسم اور شعوری دنیا سے ہے۔ اسپیس سے مراد فاصلہ ہے۔ شعوری دنیا میں فاصلے طویل ہیں کیوں کہ ہر دو قدموں کے درمیان خلا کی وجہ سے قدم قدم پر اسپیس تقسیم ہوتی ہے۔ پہلے قدم کے بعد پیر دسویں قدم پر نہیں رکھا جاتا، درمیان کے نو مراحل طے کئے جاتے ہیں جس سے گھڑی کی سوئیوں کی طرح قدموں کی رفتار تقسیم ہوجاتی ہے۔

کراچی سے لاہور پیدل جائیں یا گاڑی سے، پیدل چلنے پر جتنے قدم لئے جائیں گے، اتنی ہی مرتبہ اسپیس تقسیم ہوگی۔ اسی طرح گاڑی کے ذریعے جانے سے پہیّہ جتنی مرتبہ گھومے گا، وہ بھی اسپیس کی تقسیم میں شمار ہوگا۔

ایک دنیا خواب کی ہے جہاں کسی مقام پر پہنچنے کے لئے فاصلہ اپنی جگہ موجود ہوتا ہے مگر وقت کا احساس نہ ہونے سے فاصلہ محسوس نہیں ہوتا۔ ایک شخص اہرام کی سیاحت کے لئے پاکستان سے

* برقی مقناطیسی میدان (الیکٹرومیگنیٹک فیلڈ)

مصر جاتا ہے۔ پیسہ، وسائل، وقت اور فاصلہ تینوں درکار ہیں۔ خواب میں اہرام دیکھنے کے لئے مصر جانے کا خیال آئے تو فرد اسی وقت اہرام کے سامنے موجود ہوتا ہے، خود کو اس کے اندر دیکھتا ہے، ان کمروں میں چلا جاتا ہے جو سربمہر ہیں اور جہاں مادی جسم کے ساتھ آج تک کوئی نہیں جاسکا۔ سبب یہ ہے کہ خواب کی دنیا میں ذہن فاصلے کی بجائے وقت کو اہمیت دیتا ہے — وہ مٹی کے جسم کو نظر انداز کرکے اندر موجود حرکت اور اس کے ماخذ کے تابع ہو جاتا ہے۔ حرکت کا ماخذ کیا ہے؟

قرآن کریم میں ارشاد ہے،

"اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔"

(النور: ۳۵)

اکثر لوگوں نے نور کا ترجمہ روشنی کیا ہے جب کہ نور روشنی کا ایک اعلیٰ درجہ ہے۔ مضمون کی فہم کے لئے روشنی کی مدد سے سمجھیں تو روشنی کی رفتار تقریباً ایک لاکھ 86 ہزار دو سو82 میل فی سیکنڈ قیاس کی گئی ہے۔ یہ مٹی کی رفتار سے ہزاروں گنا زیادہ ہے۔ ذہن جب روشنی کی ہیئت میں سفر کرتا ہے جس میں حرکت کا رخ اینٹی کلاک وائز ہے تو ذہن کی رفتار ہزاروں گنا بڑھ جاتی ہے۔ خواب کی دنیا اس کا مظاہرہ ہے۔

خواب دیکھنا خیالی عمل نہیں ہے۔ قرآن کریم میں علمِ رُویا کا ذکر ہے۔ بعض خواب ایسے ہیں جن کے اثرات نیند سے جاگنے کے بعد ظاہر ہوتے ہیں جیسے زبان پر پلاؤ یا سیب وغیرہ کا ذائقہ محسوس ہونا، خوفناک منظر دیکھ کر ڈرنا یا غسل واجب ہونا۔ اس کے برعکس جب ذہن مٹی کی دنیا (عالمِ ناسوت) میں سفر کرتا ہے تو ایک، دو، تین کے بعد پانچ تک پہنچنے کے لئے وہ چوتھا قدم اٹھانے کا پابند ہے۔

بات شروع ہوئی تھی سمندر، پہاڑ اور شہد کی مکھی سے۔ شہد کی مکھی ظاہر میں چھوٹا حشرہ ہے لیکن اندر کی دنیا وسیع ہے۔ کوئی شک نہیں کہ اس حشرے پر غیر جانبداری سے تحقیق کرنے والا فرد رنگ و روشنی کے نظام سے واقف ہو جاتا ہے۔ خالقِ کائنات نے فرمایا ہے،

"اور دیکھو! تمہارے رب نے شہد کی مکھی پر یہ بات وحی کر دی کہ پہاڑوں میں اور درختوں میں اور ٹٹیوں پر چڑھائی ہوئی بیلوں میں اپنے چھتّے بنا اور ہر طرح کے پھلوں کا رس چوس اور اپنے رب کی ہموار کی ہوئی راہوں پر چلتی رہ۔

اس مکھی کے اندر سے رنگ برنگ کا ایک شربت نکلتا ہے جس میں شفا ہے لوگوں کے لئے۔ یقیناً اس میں غور و فکر کرنے والوں کے لئے نشانی ہے۔" (النحل: ۶۸۔۶۹)

اللہ نے شہد کی مکھی کو علم عطا کیا ہے کہ وہ مخلوق کے لئے شفا بخش پھولوں سے رس کشید کرے۔ ان پھولوں کا رس شہد کی مکھی کے جسم میں داخل ہوتے ہی مختلف مراحل سے گزرتا ہے اور بالآخر کیمیا بن جاتا ہے جسے قرآن کریم نے "رنگ برنگ کا شربت" کہا ہے۔

غور کیجئے کہ ہمیں شہد میں عموماً ایک رنگ نظر آتا ہے۔ باقی رنگ کہاں گئے—؟

رنگ شہد میں موجود ہیں لیکن ان رنگوں کی ویولینتھ (طولِ موج) مادی فہم کی سطح سے ماورا ہے۔ مادی فہم سے مراد وہ نگاہ ہے جو کسی شے کی سطح پر رک جاتی ہے، اس کے اندر داخل نہیں ہوتی۔ شہد کو دیکھتے ہوئے عام آدمی ذہن میں بننے والے پہلے تاثر کو شہد کے رنگ کا نام دیتا ہے جب کہ شہد رنگوں سے مرکب ہے۔

تحقیق و تلاش کے طالب علموں کے لئے یہ بات دلچسپی کی حامل ہے کہ اگر شہد میں موجود رنگوں کو دیکھ لیا جائے تو وہ مخلوقات نظر آسکتی ہیں جو ان رنگوں سے بنی ہیں اور ہماری نگاہ سے اوجھل ہیں۔ واضح ہوتا ہے کہ معنوی اعتبار سے شہد کی مکھی وہ نہیں جو ظاہر میں نظر آتی ہے۔

قارئین! آدمی بھی وہ نہیں جو نظر آتا ہے۔ آدمی مٹی کے پتلے کو اصل سمجھتا ہے جب کہ مٹی لباس ہے جس میں اس دنیا سے نکل کر دوسری دنیاؤں میں سفر کی صلاحیت نہیں۔ اسی بنا پر نیند کی دنیا میں داخل ہوتے ہی مٹی کا لباس بستر پر رہ جاتا ہے اور موت کے وقت بھی روح مٹی کا لباس اتار کر دوسری دنیا میں منتقل ہوتی ہے۔

ظاہری دنیا میں آدمی پانچ چھ فٹ کا نظر آتا ہے لیکن اندر کی دنیا میں فاصلے کی کوئی حد نہیں۔ وہ جس لمحے جہاں چاہتا ہے، چلا جاتا ہے اور وہ کچھ دیکھ لیتا ہے جو بیداری کی دنیا میں نظر نہیں آتا۔ آدمی کو اپنی معنوی حیثیت جاننے کے لئے مٹی کے جسم کو لباس سمجھ کر اندر کی دنیا میں اترنا ہے اور جاننا ہے کہ وہ کون ہے جو خواب کی دنیا میں داخل ہو کر وقت میں سفر کرنا سکھاتا ہے اور وہ کون ہے جو نیند سے جاگنے کے بعد مٹی کے جسم کا پابند کر دیتا ہے؟

مرزا جعفر حسین

لکھنؤ کا دسترخوان

لکھنؤ کی ایک پہچان نوابوں کے پکوان ہیں۔ مرزا جعفر حسین نے کتاب "لکھنؤ کا دسترخوان" میں اپنے تجربات اور معتبر ذرائع سے حاصل شدہ معلومات کی روشنی میں نوابی کھانوں کی تراکیب اور کھانے کے طور طریق دلچسپ انداز میں بیان کئے ہیں۔ کھانوں کی تراکیب تقریباً 100سال یا اس سے پرانی ہیں۔ ماہنامہ قلندر شعور کے قارئین کے لئے یہ مضمون بطور تحفہ قسط وار شائع کیا جارہا ہے۔

گزشتہ لکھنؤ کی روایات سے متعلق میرے بکثرت مضامین مختلف رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں پرانے کھانوں کا تذکرہ ضمناً آیا۔ اسی وقت سے تفصیلات کے تقاضے شروع ہو گئے تھے۔ چناں چہ ایک مضمون میں نے لکھا جس میں مخصوص غذاؤں کے پکانے کا اسلوب بھی شامل کر دیا۔ اس کے بعد سے اس موضوع پر مفصل کتاب لکھنے کے تقاضے ہونے لگے۔ ایک محترمہ نے یہاں تک تحریر فرمایا کہ

"آپ بوڑھے ہو چکے ہیں۔ آپ کا جسم بیماریوں کا بنڈل ہے لہٰذا اس موضوع پر آپ کے سینے میں جو کچھ محفوظ ہے، فوراً لکھ ڈالئے ورنہ یہ خزانہ آپ کے ساتھ دفن ہو جائے گا۔"

ان کی تحریر نے مجھے بہت متاثر کیا۔ اس تجویز کی تائید کئی صاحبِ علم حضرات نے کی۔ میرے دیرینہ دوست صباح الدین عمر صاحب اس اصرار میں سب سے زیادہ سخت گیر ہیں۔ ان کی عزت افزائی کا اعتراف نہ کرنا معصیت ہے۔ موصوف چاہتے ہیں کہ میں اپنی زندگی جو اب مختصر سے مختصر تر باقی رہ گئی ہے ــــ قلم و قرطاس (کاغذ) و تحریر کے لئے وقف کر دوں۔ بہر حال اپنے ان اور ایسے ہی تمام قدر دانوں کے احکام کی تعمیل میں یہ تالیف پیش کر رہا ہوں۔

اس ذیل میں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ یہ تالیف غذاؤں کے بارے میں مکمل تذکرے کی حیثیت نہیں رکھتی۔ بہت سی غذاؤں کا ذکر

اس میں نہیں ملے گا کیوں کہ میں ذاتی تجربات یا معتبر ذرائع سے حاصل معلومات کی بنا پر لکھنے کا عادی ہوں لہٰذا انہی کھانوں پر قلم اٹھا رہا ہوں جن سے میرے کام و دہن[1] لذت آشنا ہیں۔

اس کتاب میں ترکاریوں سے تیار ہونے والی غذاؤں کی کمی یقیناً محسوس ہوگی۔ میں معذرت کے ساتھ اس نقص کو تسلیم کرتا ہوں۔

ہمارے خاندان میں صرف سادہ ترکاریوں کا استعمال ہوتا تھا۔ میرا خود یہ حال ہے کہ بچپن سے ترکاریاں بونے کا شوق تھا اور اس فن پر اپنے ذاتی تجربات پر مشتمل ایک کتاب بھی لکھ چکا ہوں لیکن عمر کے اکیاسی برس ختم کرتے ہوئے بھی اپنے ماحول و وراثت کے اثرات سے بہت سی ترکاریوں ہی نہیں بلکہ بہت سے پھلوں کے ذائقے سے بھی محروم ہوں۔

بہر حال اتنا ضرور کہنا پڑتا ہے کہ پکانے کے جو اسلوب لکھ رہا ہوں، وہی کم و بیش ان غذاؤں کے بارے میں بھی کار آمد ثابت ہوں گے جن کا صراحت[2] کے ساتھ تذکرہ اس تالیف میں نہ مل سکے گا۔

بچپن اور عنفوان شباب[3] فراوانی اور ارزانی کے دور میں گزرا۔ یہ وہی زمانہ تھا جب رئیسوں کے دسترخوان بہار پر تھے۔ حلوان[4] گوشت، مُسکا گھی[5]، زعفران، میوہ جات وغیرہ اس وقت کم حیثیت لوگوں کی بھی دسترس میں تھے لیکن اب ان نعمتوں سے ہم محروم ہیں۔

ان حالات کے تحت خوش رائحہ[6] اور خوش رنگ غذاؤں کا تیار کرنا محال نہیں تو مشکل ہے تاہم ہر کھانے کے پکانے کا اچھا اسلوب اس کو ایک حد تک خوش ذائقہ بنا دیتا ہے۔ میں نے حتی الامکان کوشش کی ہے کہ یہ حقیر پیش کش ہر طبقے کے لوگوں کے لئے کارآمد ثابت ہو۔

آخر میں یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ اس تالیف میں کھانے پکانے سے متعلق جتنے نسخے درج ہیں، وہ سب میری زندگی بھر کی کاوش کا ماحصل ہیں۔ تخمیناً 35 برس قبل اس موضوع پر میں نے ایک کتاب لکھنا شروع کی تھی مگر بعض وجوہ سے اسے مکمل نہیں کر سکا تھا۔

لکھنؤ کے دسترخوان کے موضوع پر کتاب لکھنے کی اتر پردیش اردو اکادمی کی فرمائش اشہبِ شوق[7] کو تازیانہ ہوئی اور مجھے اس کتاب کو مکمل کرنے کا موقع نصیب ہوا۔

پیش گفت

گزشتہ زمانے میں کہا جاتا تھا کہ کھانا کھانے کا وہی وقت ہے جب غریبوں کو روزی مل جائے اور رئیسوں کا دسترخوان بچھ جائے۔ اس قول میں غریبوں سے وہ محنت کش اور مفلوک الحال مراد تھے جن کو اپنی روٹی کمانے کے لئے شبانہ روز کام کرنا پڑتا ہے۔ ایسے لوگ فرصت کے اوقات میں جو مل جاتا، اسی پر قناعت کر کے اپنا اور اہل و عیال کا پیٹ پالتے تھے۔ لیکن قدیم لکھنؤ کی تہذیب کا یہی تقاضا تھا کہ دسترخوان ہر امیر و غریب کے گھر میں بچھتا تھا۔ صاحبِ خانہ[8] مع اہل وعیال کے کھانا کھاتا تھا البتہ مہمان آجاتا تو مردانہ دسترخوان مکان کے بیرونی حصے میں علیحدہ بچھتا تھا۔ یہ طرز مشترک تھی۔

رؤسا کے دسترخوانوں پر غذاؤں کی افراط[9] رہتی اور خاصانوش کرنے کا وقت ان کی مرضی پر آتا تھا۔ کہنے کو ہر رئیس کے یہاں کھانا کھانے کا وقت معین تھا مگر پابندی نہیں تھی پھر بھی عموماً دن میں دوپہر کے دو بجے اور رات کو گیارہ بجے تک دسترخوان بچھ جاتے تھے۔

بعض رئیس دونوں وقت محل کے باہر کھانا کھاتے تھے، کچھ دن میں ایک بار اور کچھ رؤسا مقررہ دنوں پر بیرونی نشست میں خاصانوش فرماتے تھے۔ اس وقت حاضر الوقت عزیزوں، دوستوں اور مقربین و منسلکین کا شریکِ طعام ہونا ضروری تھا۔ انہی رئیسوں میں پرنس باقر علی خاں کے یہاں ہر آنے والے کے لئے بلا لحاظِ وقت کھانا کھانا فرض تھا۔ موصوف مغلوب الغضب تھے۔ کوئی انکار کرتا تو برہم ہو جاتے۔

دسترخوان پر کھانا کھانے کی تہذیب بھی رؤسا و شرفا کے یہاں یکساں طور پر ملحوظ رکھی جاتی تھی۔ جو جس طرح بیٹھ جاتا ـــ آخر وقت تک اسی طرح بیٹھا رہتا تھا، نشست میں اتنی شائستگی برتی جاتی تھی کہ ہاتھ اور منہ کے علاوہ کوئی حرکت معیوب سمجھی جاتی۔ دورانِ طعام مہذب اور صرف تفریحی گفتگو ہوتی تھی۔ کھانا کھانے میں خیال رکھا جاتا تھا کہ ایک ایک لقمہ خوب چبا چبا کر کھایا جائے اور چبانے میں ہلکی سے ہلکی آواز تک نہ نکلے۔

رؤسا کے یہاں دسترخوان بچھنے کا حکم صادر ہونے اور حاضرین کے کھانا شروع کرنے کا وقفہ طویل تھا۔ ملازمین کی تعداد وافر ہونے کے باوجود انتظامات میں کافی وقت صرف ہوتا تھا۔ سب سے پہلے لوٹے اور سلفچیاں ہاتھ دھلانے

کے لئے لائی جاتیں۔ پھر ہر شریکِ طعام کے لئے علیحدہ علیحدہ پانی پلانے کا بندوبست ہوتا۔ انتظامات ہونے کے بعد دسترخوان بچھتے تھے جو بعض رئیسوں کے یہاں ان کے بڑے ہال کی لمبائی کے قریب قریب برابر ہوتے تھے۔ اتنا بڑا دسترخوان اس لئے ضروری تھا کیوں کہ اس زمانے میں کھانے والوں کے سامنے خالی پلیٹیں لگا کر ڈشوں اور ڈونگوں میں غذائیں پیش کرنے کا دستور نہیں تھا بلکہ ہر شخص کے آگے ہر چیز علیحدہ علیحدہ برتن میں لگائی جاتی تھی البتہ گرم گرم پلاؤ، مزعفر، متنجن یا دوسری مخصوص غذائیں بڑے بڑے تھالوں یا قابوں میں دستر خوان پر آتی تھیں۔ رئیس کے حضور خاصگی کھانے بھی رہتے تھے۔ وہ اپنی مرضی اور خوش نودی سے دوسروں کو شریک کرتا تھا۔

عام حاضرین کے سامنے چار پانچ سے لے کر چھ سات برتنوں میں کھانے لگائے جاتے تھے۔ رئیس کے حضور دسترخوان پر ہر غذا کے لئے دو ظروف رہا کرتے تھے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ بسا اوقات بعض برتنوں میں جتنا کھانا آتا، وہ اسی طرح اٹھا لیا جاتا تھا۔ چکھنے کی بھی نوبت نہیں آتی تھی۔ بچا ہوا کھانا ان ملازمین کا حصہ ہوتا تھا جو مطبخ سے کھانے کے خوان اپنے سروں پر اٹھا کر لاتے تھے۔

ہر رئیس کے دستر خوان کی دو تین چیزیں اپنی آپ مثال تھیں۔ انہی کی وجہ سے وہ دسترخوان مشہور تھا۔ یہ خصوصیت پشت در پشت[10] برقرار رہتی تھی۔ اخلاف[11] بزرگوں کی وضع داری میں فرق نہیں آنے دیتے تھے۔ مثال کے طور پر کہا جاسکتا ہے کہ میرے مورثِ اعلیٰ نواب تفضل حسین خاں کے دسترخوان کی مچھلی، بادشاہ پسند دال اور سلطانی دال، نانا صاحب نواب حکیم شفاء الدولہ کے یہاں کے کوفتہ معلائے عجمی، آخری دور میں عمّ[12] محترم حکیم فضل حسین خاں کا پسندیدہ شش رنگا، برادر مرحوم حکیم صاحب عالم کے گھر کی شب دیگ اور نہاری، شیخ علی عباس مرحوم کے باورچی کا پکایا ہوا مٹر پلاؤ اور مرزا بہادر مرزا محمد عباس علی خاں کے مطبخ کی میٹھی روٹی مشہور و ممتاز غذائیں تھیں۔

مرزا بہادر کے یہاں کی روٹی ان کے مطبخ[13] کے علاوہ کم سے کم اس دور میں کہیں اور نہیں پک سکی۔ یہ روٹی لگ بھگ دو من کے وزن میں میدہ اور قند سے پکائی جاتی تھی اور ان اجزائے ترکیبی کو گوندھنے میں 30 سیر گھی جذب کروایا

جاتا تھا— گوندھنا سخت مرحلہ تھا۔ یہ ریاضت ہنرمندی کے ساتھ متعدد بار کرنا ہوتی تھی۔ اس کے بعد گھی پوری طرح جذب ہوتا اور روٹی بنا کر پکانے کے قابل ہوتی ۔ دو من وزن کے میدہ و قند اور 30 سیر گھی کی شمولیت سے صرف ایک اور کبھی دو روٹیاں تیار ہوتی تھیں۔ روٹیاں تنور میں پکائی جاتی تھیں ۔ ہر بڑے رئیس کے مطبخ میں تنور تھا اور باورچی اتنا ہنرمند ہوتا کہ تنور میں آسانی سے روٹیاں یا شیر مال وغیرہ پکا سکتا تھا۔ میٹھی روٹی تیاری کے بعد ٹکڑے کر کے دستر خوان پر بڑی بڑی کشتیوں[۱۴] میں لگا دی جاتی۔ ان ٹکڑوں کے مزید ٹکڑے کئے جاتے۔ کھانے میں بہت خستہ اور لذیذ تھیں۔ اب اس غذا کو پکوانے اور پکانے والا کوئی نظر نہیں آتا۔

ہر بڑے چھوٹے رئیس کے دسترخوان پر تقریباً روز یا دوسرے تیسرے روز کسی عزیز کے یہاں سے مخصوص غذا ضرور آتی تھی۔ کبھی چوک سے بھی کوئی پسندیدہ غذا منگالی جاتی تھی۔ اس زمانے میں بازار کی دکانوں پر بھی نفیس و لذیذ اشیائے خوردنی فروخت ہوتی تھیں جن کو رؤسا و عمائدین بھی اپنے دسترخوانوں پر طلب کر کے نوش فرماتے تھے۔ چناں چہ بیسویں صدی کے اوائل میں عبداللہ کی دکان کی پوریاں اور کچوریاں، سعادت کے یہاں کی شیر مالیں اور گاؤ زبانیں، احمد کی تیار کردہ باقرخانیاں، شبراتی کے پکائے ہوئے اٹھارہ پرت کے پراٹھے، شاہد کی دکان کے متعدد اقسام کے پلاؤ بالخصوص بٹیر پلاؤ، چھمن کا پکایا ہوا مرغ مسلم، ٹنڈے کی دکان کے تیتر کے کباب اور اسی طرح کی دوسری نمکین چیزیں بہت نفیس و لذیذ غذائیں تھیں جو معمولی قیمت پر فروخت ہوتی تھیں۔

میٹھی چیزوں میں حیدر حسین خاں صاحب کے پھاٹک سے متصل ایک دکان پر بے مثل اناس کا مزعفر ہر روز تیار ملتا تھا اور ہر شام کو دارالشفا کے محاذی کپتان کے کنوئیں سے متصل خوانچے والے میوہ جات کی برفیاں فروخت کرتے تھے۔ ہر برفی آٹھ آنہ فی سیر کے نرخ سے ملتی تھی اور خوش بو، لذت اور رنگ روپ میں اپنا آپ جواب ہوتی تھی۔ ان بے شمار انواع و اقسام کی نمکین اور شیریں چیزوں کی فراوانی و ارزانی ہر حیثیت کے آدمی کے کام و دہن کو آسودگی بخشنے کی ضامن تھی۔

کھانے والوں میں ہر شخص کا مذاق[۱۵] بلند تھا اور پکانے والوں میں بھی، خواہ رئیسوں کے

باورچی ہوں یا بازاروں کے نان بائی، سب ہی ہنر مند اور باسلیقہ تھے۔ مراتب میں ضرور فرق تھا لیکن عموماً فن کار کسی نہ کسی اعلیٰ صلاحیت کا مالک ہوتا تھا۔ رئیسوں کے بعض باورچی اپنی پکائی ہوئی پتیلیوں میں دوسرے کو ہاتھ لگانے نہیں دیتے تھے۔ وہ خود برتنوں میں کھانے نکال کر دسترخوان پر حاضر کراتے تھے۔ ان کے نزدیک برتن میں کھانا نکالنا بھی ایک فن تھا۔

رؤسا و شرفا کے دسترخوانوں پر روزمرہ کی غذاؤں میں کم سے کم قورمہ خواہ سادہ کیوں نہ ہو، ایک قسم کے کباب اور قیمہ یا اسی قسم کی کوئی چیز ہونا ضروری تھا۔ اعلیٰ درجے کے پراٹھے نہ ہوں تب بھی چپاتیوں کے ساتھ پوریاں شامل رہتی تھیں۔ سادہ پلاؤ عام کھانا تھا، سادے چاول بھی اعلیٰ قسم کے اور لونگ الائچی سے بگھرے ہوئے ہوتے تھے۔ ایسے چاول دال سے کھائے جاتے تھے اور دال کے پکانے میں بھی گھر گھر تکلفات کئے جاتے تھے تاکہ سب سے زیادہ سستی غذا کو بھی گراں قدر بنایا جاسکے۔ آخر میں شیریں غذائیں کھانا بھی دستور میں داخل تھا جس کو منہ میٹھا کرنا کہتے تھے۔ (جاری ہے)

مشکل الفاظ کے معانی

۱۔ دہن (منہ)
۲۔ صراحت (وضاحت، تشریح)
۳۔ عنفوانِ شباب (آغازِ جوانی)
۴۔ حلوان (کم عمر جانور کا گوشت، گائے بکری کے چھ ماہ کی عمر تک کے بچے کا گوشت)
۵۔ مسکا گھی (تازہ نکلا ہوا کچا گھی، مکھن)
۶۔ رائحہ (بو، خوش بو، مہک)
۷۔ اشہبِ شوق (شوقِ طلب)
۸۔ صاحبِ خانہ (گھر کا سربراہ)
۹۔ افراط (فراوانی، کثرت، بہتات)
۱۰۔ پشت درپشت (نسل درنسل)
۱۱۔ اخلاف (اسلاف کی ضد، پوتے پڑپوتے، اولاد، نئی پود)
۱۲۔ عمّ (تایا، چچا)
۱۳۔ مطبخ (باورچی خانہ)
۱۴۔ کشتیوں (دھات، شیشے یا لکڑی کا مستطیل یا بیضوی تھال)
۱۵۔ مذاق (ذوق، رجحان، قوتِ ذائقہ، چکھنے کی قوت یا حس)

Canderel®
with Stevia
Naturally Sweet
Canderel
Stevia
Canderel
Canderel Stevia
Zero Calorie
Sweetener
Available in
Tablets, Sachets and Jars
SEARLE

TARKHANA HOMES
New Homes For Sale in Multan & Lahore
For More Details : +92 345 4121 910

21 کروڑ کلو میٹر

مرکزی خیال : آدمی نے ہر دور میں ٹائم اور اسپیس کی اہمیت کو جانا ہے۔ محققین کی کوشش رہی ہے کہ ٹائم اور اسپیس کی نفی سے بھرپور زندگی (Smart Life) گزار سکیں۔ لہروں پر مبنی اطلاعاتی و خیالی نظام آدمی کے لئے نیا نہیں، مصر اور مایہ کے اہرام ہنوز لہروں کے اسرار کی ہزاروں سال پرانی کاوشوں کا ایک زاویہ بیان کر رہے ہیں۔ گلیلیو، نیوٹن، میکس ویل، آئن اسٹائن، اسکروڈنجر اور ڈاکٹر عبدالسلام جیسے کئی نوبل انعام یافتہ محققین نے لہروں سے متعلق قوانین سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی۔ مادی طبیعیات سے گزر کر جب خیالات نے مابعد الطبیعیات پر کمند ڈالنے کی کوشش کی تو ان کا ذہن مصلحتاً مادے (matter) میں گرفتار رہا۔ زیر نظر مضمون میں تحقیقی رجحان کی دو سمتوں کا تذکرہ ہے۔ خارج میں یہ رخ آدمی کی حسی، عضلاتی، فعلیاتی اور نفسیاتی تفہیم سے گزر کر ذہنی نقوش بناتا ہے۔ آدمی نے ہر دور اور زبان میں ان نقوش کو اپنے مطابق نام دیئے ہیں۔ باطن یا حالتِ نیند میں بھی نقوش بنتے ہیں مگر یہاں مادی جسم کی شمولیت دکھائی نہیں دیتی۔ دونوں حالتوں میں فرق ٹائم اور اسپیس کی رفتار کا ہے۔ اگر آج کا محقق مادیت میں تبدیلی کو سمجھنا چاہتا ہے تو اسے مادے (matter) کی اسپیس کے پیچھے کارفرما 'زمانیت' (Time) کا علم حاصل کرنا ہوگا۔

فی زمانہ مادی علوم کی تعداد لگ بھگ ساڑھے چھ سو بتائی جاتی ہے۔ ان میں ریاضی، جغرافیہ، تاریخ، ڈرائنگ، لسانیات، ادب، علمِ صنعت، ثقافت، حیاتیات، نباتات، ارضیات، فلکیات، کیمیا، طبیعیات، منطق، سیاسیات، علم العلوم یعنی epistemology اور دیگر علوم شامل ہیں۔

Play گروپ یا کنڈر گارٹن کے درجے سے لے کر کسی خاص علم میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے میں لگ بھگ 22 سال لگتے ہیں۔ جیسے علاج کرنے کے لئے مستند میڈیکل ڈگری

کا حصول ضروری ہے، اسی طرح پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد آدمی کو متعلقہ شعبے میں مستند محقق تسلیم کیا جاتا ہے۔ محققین کے کام کا جائزہ لیا جائے تو ایک دو دہائی کے بعد گزشتہ نظریات میں تبدیلی نظر آتی ہے۔نئے مشاہداتی زاویے پرانے حقائق کی جگہ لے لیتے ہیں۔یوں مادی تحقیق کا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔

مادے کے کئی وجود بتائے جاتے ہیں جیسے مائع، ٹھوس، گیس، پلازما، قوسِ قزح کی روشنیاں، زیریں سرخ روشنیاں، بالائے بنفشی روشنیاں، ایکس رے، لیزر اور تاب کار روشنیاں۔ خیال آسکتا ہے کہ روشنیوں کو matter میں کیوں شمار کیا گیا، یہ کس طرح matter ہوئیں؟ جواب یہ ہے کہ ہر روشنی کسی نہ کسی میڈیم سے گزرنے سے قاصر ہوتی ہے مثلاً تاب کار روشنیاں سیسے کی شیٹ سے نہیں گزرتیں۔ ماہرین و محققین سے مشاہدات بیان کرنے کی درخواست ہے۔

روشنی کی مادی لطافت کے بعد کیا ہے؟

نیوٹرل ذہن کا محقق اس نکتے پر غور کرتا ہے تو بہت سے سوال ذہن میں آتے ہیں۔ مادے کے تمام وجود ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل ہوتے ہیں۔ رنگ و روشنی سے گیسی وجود، گیس سے مائع اور پھر ٹھوس۔ آپ پانی کی مختلف حالتوں پر غور کر سکتے ہیں۔

سیکنڈری اسکول میں علمِ طبیعیات و کیمیا میں "قانون بقائے مادہ" پڑھایا جاتا ہے جو کہتا ہے،

"مادہ نہ تو پیدا کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی فنا مگر ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل ہو سکتا ہے۔"

غور کریں کہ کیا قانون کا پہلا حصہ دوسرے حصے کی تردید نہیں؟ قانون بقائے مادہ کے مطابق مادی حالت میں تبدیلی اس وقت زیر بحث آئے گی جب مادے کا وجود ہوگا۔ نظر آنے اور نظر نہ آنے والی روشنی کی گیس، مائع یا ٹھوس حالت میں تبدیلی اس وقت ممکن ہوگی جب روشنی کا سورس معلوم ہو۔

حقیقت آشنا خواتین و حضرات بتاتے ہیں کہ روشنی کی اساس ایک اور لطیف روشنی ہے۔ غور کرنے پر یہ نقطہ روشن ہوتا ہے کہ کائنات اور اس میں موجودات درجہ بہ درجہ روشنی کا تنزل ہیں۔ مادی علوم سے آراستہ شعور کی حسیات کی رفتار اس قدر کم ہے کہ وہ مادے سے مادے میں

تبدیلی کو ریکارڈ نہیں کر سکتیں۔ یہی وجہ ہے کہ صاحبِ حال افراد مظہر کو حقیقت قرار نہیں دیتے بلکہ مظاہرے کی اساس یا کنہ تک جانے کی تلقین کرتے ہیں۔

اس سے یہ مفہوم اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ہر تخلیق روشنی کے درجہ بہ درجہ تنزل کا مظاہرہ ہے۔ مخلوقات میں تغیر روشنی کے مخصوص تناسب کے تحت ہے۔ تناسب کی انفارمیشن مذکورہ روشنیوں میں لحہ لحہ نشر ہوتی ہے اور یہ نشریات تسلسل سے حرکت میں ہیں۔ حرکت کی وجہ سے تخلیقات کے نقوش میں تغیر ہے۔ گزشتہ اقساط میں ذکر کیا جاچکا ہے کہ ہر وہ مشاہدہ، ریکارڈ اور احساس فکشن ہے جس میں تغیر واقع ہو۔ ایسے میں ہم بیان کی گئی حرکت یا نشریات کو حقیقت کہیں یا فکشن؟

زمین کی فضا سے نکل کر کہکشانی نظام پر کمند ڈالنے کی جستجو آدمی کو ہمیشہ سے ہے۔

۱۔ جستجو اور اس کے مختلف پہلو کیا ہیں؟

۲۔ جستجو کی فکشن اور مطلق (absolute) حیثیت یا اضافیت کیا ہے؟

آیئے اس سیاق وسباق میں ہر دور اور اقوام کے عروج و زوال کو الہامی روشنی (علم) میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

سال 2021ء میں مختلف ممالک کی طرف سے بیانات دیئے گئے کہ ان کی خلائی گاڑیاں سیارہ ''مریخ'' پر کامیابی سے اتر گئی ہیں اور چھ کھرب روپے مالیت کی یہ روبوٹ گاڑیاں مریخ کی سطح سے مٹی کے نمونے جمع کر رہی ہیں۔ ان ممالک کے مطابق موجودہ ٹیکنالوجی کی مدد سے فی الحال ان گاڑیوں کی واپسی ناممکن ہے۔

زمین سے 21 کروڑ کلومیٹر مسافت پر بتائے جانے والے مریخ کی جستجو کے پیچھے مقاصد کیا ہیں؟ جن دنوں مریخ پر اترنے کا دعویٰ کیا گیا، کرہ ارض پر تمام خاص و عام افراد، دانشور، محقق اور ٹیکنالوجی کے ماہرین کورونا نامی وبا سے گزر رہے تھے۔ 195 ممالک کے باشندے درجہ دوم کے انفلوئنزا سے لقمۂ اجل بن رہے تھے۔ وبا کی خبر پھیلتے ہی طبیب، سرمایہ داروں اور دانشوروں نے خاندان اور دوست احباب کو تنہا چھوڑ دیا۔ معمولاتِ زندگی انجانے خوف سے درہم برہم ہوگئے۔ علاوہ ازیں برّی، بحری اور فضائی آمد و رفت (ٹرانسپورٹ) معطل کر دی گئی۔ ہر قسم کی خوراک کی ترسیل بند ہوگئی۔

معاشرتی توازن کے لئے آدمی، آدمی کی دوا

ہے۔ یہ نظام ہر دیدہ و نادیدہ مخلوق میں ہے۔ تمام تخلیقی اکائیاں اپنی اسپیس یا حدود میں کردار ادا کرتی ہیں۔ سورج، چاند، سیارے، سمندر، پہاڑ، ریگستان، جنگل، جراثیم و بیکٹیریا، چرند پرند، بنی نوعِ آدم اور دیگر مخلوقات، سب کے کردار کا تعین خالقِ کائنات نے فرمادیا ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے،

"اس کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جنہیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ بحر و بر میں جو کچھ ہے، سب سے وہ واقف ہے۔ درخت سے گرنے والا کوئی پتّا ایسا نہیں جس کا اسے علم نہ ہو۔" (الانعام: ۵۹)

ہندومت کی کتاب "رگ وید" میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت وقدرت کے بارے میں لکھا ہے،

"ایشور، تیرے جیسا کوئی نہیں، تو نیچر کا مالک ہے۔ کائنات میں تیری ہی شکتی اور راج ہے۔ تیرے جیسی صفات کسی میں نہیں ہیں۔ کوئی پرندہ تیری بلندیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا، تیری طاقت کے بغیر کوئی دریا نہیں بہہ سکتا، کوئی پہاڑ تیری طاقت کے بغیر کھڑا نہیں رہ سکتا۔ ہم تیرے قوانین کی پابندی کرتے ہیں، تو ہماری زندگی کو درماندہ نہ فرما۔"

(رگ وید، ۱۱-۶-۲۴)

تمام الہامی کتابوں کے مطابق نوعِ آدم کو کائنات کے تخلیقی فارمولوں پر ایک حد تک تصرف کی آزادی ہے۔ ان کا علم خالقِ کائنات کی جانب سے مدد اور حکم کے تحت عطا ہوتا ہے تاکہ آدمی اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کرے۔

اللہ نے آدمی کو اختیار عطا کیا ہے کہ وہ اپنی صلاحیتیں کسی بھی طرز میں استعمال کر سکتا ہے۔ خیر وشر یا تعمیر وتخریب۔ ہر طرز میں کاوش کے نتائج کائنات کی ساری مخلوقات پر مرتب ہوتے ہیں۔ کورونا وائرس کی مثال سامنے ہے۔

بتایا جاتا ہے کہ اس کے تجربات حیوانات پر کئے گئے۔ 1995ء کے تحقیقی جرنلوں میں ایسے مختلف نوعیت کے مصنوعی وائرس کی تیاری اور اوصاف سے متعلق مضامین ہیں جن میں ایسے ایسے منافق وائرسوں کا ذکر ہے جو آدمی کے جسمانی دفاعی نظام کے لئے بے ضرر معلوم ہوتے ہیں مگر جسم میں داخل ہو کر جب وہ اپنا خول اتارتے ہیں تو تب تک دیر ہو چکی ہوتی ہے۔ اس سے آپ اندازہ لگاسکتے ہیں کہ وائرس محض ایک ٹول ہے جو کہیں نہ کہیں آدمی کے منافق یا تخریبی ذہن کی پیداوار ہے۔

2021ء - 2019ء کے 1000 دنوں میں

ذرائع ابلاغ بالخصوص سوشل میڈیا کی خبروں نے آدمی کے یقین کو توڑ دیا۔ نیوٹرل ذہن سے تجزیہ کریں تو واضح ہوتا ہے کہ یقین کورونا وائرس کی وجہ سے نہیں ٹوٹا ــــ اصل میں فرد نے خود کو خوش و خرم رکھنے کے لئے جن وسائل پر اندھا بھروسا کیا تھا، وہ دھرے کے دھرے رہ گئے۔ ان میں دولت، صحت، ماں باپ، اولاد، ذرائع نقل و حمل، سائنس و ٹیکنالوجی وغیرہ شامل ہیں۔

صاحبِ حال خواتین و حضرات بتاتے ہیں کہ یقین کوئی عارضی کیفیت نہیں جو وسائل کی کمی بیشی یا اضافیت سے بڑھتی گھٹتی ہے۔ یقین کی نعمت قادرِ مطلق ہستی اللہ پر توکل سے حاصل ہوتی ہے۔ "کمی بیشی" فکشن کے سوا کچھ نہیں۔ ایسے میں ذہن میں سوال کی گونج ہوسکتی ہے کہ توکل یا کامل بھروسے کی مطلق (absolute) طرزیں کیسے بیدار کی جاتی ہیں؟

تاریخ گواہ ہے کہ اسی طرح کے ایک خیال نے امام غزالیؒ کے افکار کو بدل دیا۔ 1095ء میں جب وہ اپنے کیریئر کی بلندیوں پر تھے، ایک مفتی و فلاسفر اور شہنشاہ نظام الملک کے مذہبی ایڈوائزر کی حیثیت میں ان کا کوئی ہم عصر نہ تھا۔

امام غزالیؒ کو خیال آیا کہ وہ خالقِ کائنات کی موجودگی کو کائناتی اشیا کی اضافیت (relativity) سے ثابت کریں۔ قارئین! وہ نظریات جن کی بنیاد اضافیت پر ہو، وہ کسی بھی وقت منطقی لحاظ سے ڈھیر ہوسکتی ہیں۔

امام غزالیؒ نے خود سے پوچھا کہ اگر کائنات کا وجود نہ ہو تو اضافیت کا تصور ناممکن ہے۔ خیال نے شدت اختیار کی۔ فکر پر رنگوں کا دباؤ بڑھا۔ ذہن میں ایک ہی سوال تھا کہ قادرِ مطلق ذات کا تغیر سے گزرنے والی تخلیقات سے کیسے موازنہ کیا جاسکتا ہے۔

قصہ مختصر امام غزالیؒ تمام عہدے اور لائف اسٹائل کے رنگ چھوڑ کر مطلق ذات اللہ کی تلاش میں نگر نگر سرگرداں ہوئے تاآنکہ تلاش نے اللہ کے ایک دوست سے ملادیا جن کی تربیت سے وہ حقیقی رنگ سے واقف ہوئے۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے،

"کہو! اللہ کا رنگ اختیار کرو۔ اس کے رنگ سے اچھا اور کس کا رنگ ہوگا اور ہم اسی کی بندگی کرنے والے ہیں۔" (البقرۃ: ۱۳۸)

(قسط: ۱۶)

سرورق کی تشریح

"ماہنامہ قلندر شعور" کا ہر سرورق باطنی علوم کی عقدہ کشائی کی دستاویز اور غور و فکر کی دعوتِ عام ہے۔ اپریل کے شمارے کے سرورق پر حضرت بو علی شاہ قلندرؒ کے مزار کا عکس ہے اور ان کی ایک مثنوی سے چند اشعار کا ترجمہ لکھا ہے جو صاحبِ مزار کے فضائل و مناقب کا ایک اظہار ہے۔

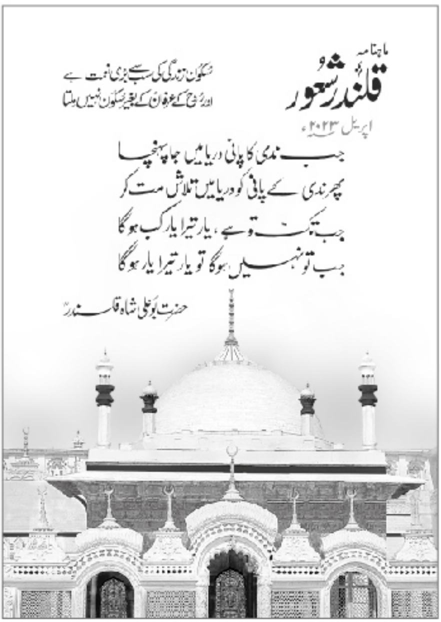

اشعار کے بغور مطالعے اور لفظ "قلندر" پر غور و فکر سے خوش گوار حیرت ہوئی۔

پہاڑوں سے چشموں، گلیشیر اور بارش کا پانی چھوٹی چھوٹی ندیوں کی شکل میں نیچے بہتا ہے۔ ایک ندی بالآخر دوسری ندی سے ملتی ہے پھر تیسری، چوتھی اور پانچویں ندی سب شامل ہوتی چلی جاتی ہیں اور دریا بن جاتا ہے۔ دریا بننے کا مطلب ہے کہ انفرادیت اجتماعیت بن گئی ہے۔ مختلف راستوں سے آنے والے پانی نے ایک راستہ اختیار کر لیا ہے اور انفرادی تخصیص ختم ہو گئی ہے۔

یہاں ایک نکتہ قابلِ غور ہے۔ اگرچہ دریا بننے سے پہلے ندیوں کا پانی الگ الگ ہے مگر ان کے پانی کا ماخذ ایک ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب پانی ایک ہے تو پھر ندیوں کا الگ الگ وجود کیوں ہے—؟

یہ اصل سے دوری کا مظاہرہ ہے اور دوری انفرادیت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دوری میں حکمت رکھی ہے کہ یہ اصل کی اہمیت اجاگر کرتی ہے اور وصل کی طلب پیدا کرتی ہے۔

ندی کا پانی دریا سے دور ہے لیکن دریا سے واصل ہونے کا مشتاق ہے۔ وہ ذوق و شوق میں دریا کی جانب بڑھتا ہے۔ راستے کے نشیب و فراز کو خاطر میں نہیں لاتا۔ پتھریلے اور خاردار راستے اس کے سامنے رکاوٹ نہیں بنتے حتیٰ کہ وہ دریا سے مل جاتا ہے۔ نتیجے میں ندی کو اپنی کم مائیگی اور دریا کی وسعت و بے کرانی کا ادراک ہوتا ہے۔ اگر وہ دریا سے الگ نہ ہوتی تو دریا کا تعارف حاصل نہ ہوتا۔

حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ فرماتے ہیں،

جب ندی کا پانی دریا میں جا پہنچا
پھر ندی کے پانی کو دریا میں تلاش مت کر
جب تک تو ہے، یار تیرا یار کب ہوگا
جب تو نہیں ہوگا تو یار تیرا یار ہوگا

اللہ تعالیٰ نے کائنات کی تخلیق کا ارادہ فرمایا تو ایک طرح سے دوری کے نظام کی تخلیق کا ارادہ کیا یعنی کائنات کا وجود خالق کے ارادے سے غیب سے ظاہر ہوگیا مگر اس طرح کہ دوری کے باوجود قربت قائم ہے—اللہ نے ہر تخلیق کو اپنی پہچان کا علم عطا کیا ہے۔

محقق (سائنس دان) شب و روز ایک کرکے لیبارٹریوں میں کائنات اور اس کے اجزا کی اصل کو جاننے اور سمجھنے کا کھوج لگاتے ہیں۔ مفکر اور فلسفی اشیا اور عوامل کو سمجھنے اور ان کی حقیقت سے واقف ہونے کے لئے سرگرداں رہتے ہیں۔ شروع زمانے سے لے کر اب تک ایسا ہورہا ہے۔

لوگ کائنات سے کیوں واقف ہونا چاہتے ہیں—؟

اس کی اصل کا کھوج کیوں لگاتے ہیں—؟

لوگ پریشان کیوں ہیں اور نجات حاصل کرکے سکون کی تلاش کیوں کرتے ہیں—؟

پریشانی کی اصل کیا ہے—؟ خوف کی اصل کیا ہے اور ان سے نجات پانے کی جدوجہد کیا ہے—؟

ندی کے پانی کی دریا سے واصل ہونے کی جدوجہد میں ان سوالوں کا جواب موجود ہے۔

یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ ندی کا پانی دریا سے واصل ہوا تو کیا بات ختم ہوگئی—؟

جو ادراک حاصل ہونا چاہئے تھا، کیا وہ حاصل ہوا—؟

سمندر یا دریا کا پانی اس عمل کو دہرانا چاہتا ہے اور بار بار دہراتا ہے۔ وہ بخارات میں تبدیل ہوتا ہے، دور دراز مقامات کی جانب رواں ہوتا ہے، بارش کی صورت میں برس کر ندیوں میں بہتا ہے اور پھر دریا سے واصل ہوتا ہے۔ اس عمل کو بار بار دہرانے سے دوری — قرب میں سفر کرتی ہے۔

خانوادہ سلسلہ عظیمیہ محترم عظیمی صاحب نے "قلندر" کی تعریف ان الفاظ میں بیان کی ہے،

"۔۔۔ یہاں تک کہ اس کا عروج اور نزول ایک ہو جائے۔ جزو میں کُل اور کُل میں جزو کو دیکھے پھر ان تمام سے مستغنی ہو کر حیرتِ محمودہ یعنی سُرور میں رہے تو اس کو 'قلندر' کہتے ہیں۔ یہ قلندر کا مقام محبوبیت کے مقام سے اعلیٰ ہے کیوں کہ محبوبیت کے مقام میں پھر بھی دوئی باقی رہتی ہے کہ ایک عاشق، دوسرا معشوق ہوتا ہے لیکن قلندری کا مقام یہ ہے کہ یہاں دوئی بالکل باقی نہیں رہتی، من تو شدم تو من شدی کا معاملہ بن جاتا ہے۔"

تشریح: مکمل مینا

جب ندی کا پانی دریا میں گیا تو اسے دریا میں تلاش نہ کر کہ اپنی انفرادیت ختم کر کے وہ دریا بن گیا ہے۔ جب دریا سمندر میں گرتا ہے تو سمندر کے بحرِ بے کراں میں خود کو فنا کر دیتا ہے۔ بقول شاعر،

کہہ رہا ہے شورِ دریا سے سمندر کا سکوت
جس کا جتنا ظرف ہے اتنا ہی وہ خاموش ہے

زاویۂ نظر صحیح نہ ہو تو مفروضے اور حقیقت کی تمیز کرنے کی صلاحیت متاثر ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دیکھنے، جانچنے اور پرکھنے کی صلاحیت عطا کی ہے۔ زاویۂ نظر پیغمبرانہ طرزِ فکر کے مطابق ہے تو آدمی صراطِ مستقیم پر قائم رہتا ہے اور جانتا ہے کہ جب تک میں رہتی ہے، آدمی اصل سے دور ہوتا ہے، جب میں ختم ہو جاتی ہے تو آدمی اصل سے واصل ہو جاتا ہے۔ (عدنان نذیر۔ اٹک)

خورشید احمد

پہلے مچھر کو ملیریا ہوتا ہے
پھر آدمی کو ۔۔۔۔

ماہرین کہتے ہیں کہ لیمن گراس میں دو ایسے کیمیائی مادے پائے جاتے ہیں جو مچھروں کو بھگانے میں مدد دیتے ہیں۔ لیمن گراس کے پتّے توڑ کر باریک کاٹ لیں یا پیس لیں۔ اس کا پیسٹ جسم کے کھلے حصوں پر لگانے سے مچھر بھاگ جاتے ہیں۔

ملیریا اور ڈینگی کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ مچھروں کے ذریعے پھیلتے ہیں۔ اب تک کی تحقیقات کے مطابق مچھروں کے ذریعے پھیلنے والی بیماریاں پانچ قسم کی ہیں — زیکا وائرس، مغربی نیل وائرس، چکن گونیا وائرس، ڈینگی اور ملیریا۔ ایک دوسرے سے مختلف ہو کر بھی ان میں مماثلت یہ ہے کہ فوری علاج نہ کرنے پر ان میں سے ہر بیماری خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ جراثیم کی یہ پانچوں اقسام ہر مچھر میں ہوں۔

دلچسپ امر یہ ہے کہ مذکورہ جراثیم (وائرس) کی پیدائش مچھروں کے جسم میں نہیں ہوتی بلکہ مچھر خود ان کے متاثرین میں سے ہیں۔ پہلے مچھر کو چکن گونیا یا ملیریا ہوتا ہے پھر مچھر جسے کاٹتا ہے، جراثیم اسے منتقل ہو جاتے ہیں۔

مچھروں میں یہ جراثیم ایسے جانداروں سے منتقل ہوتے ہیں جو اس بیماری میں مبتلا ہوں۔ جب مچھر ان کا خون پیتے ہیں تو جراثیم مچھروں کو منتقل ہو جاتے ہیں اور ان کے ذریعے پھیلتے ہیں۔ مچھروں کا ٹیسٹ ہوتا ہے نہ ویکسین لگائی جاتی ہے اس لئے بہتر ہے کہ ان سے بچا جائے۔

مچھر دانی قدیم دور سے استعمال ہو رہی ہے۔ حیران کن ہے کہ صابن دانی میں صابن ہوتا ہے اور نمک دانی میں نمک لیکن مچھر دانی میں آدمی ہوتا ہے یا عورت ہوتی ہے۔ ممکن ہے کوئی ذہین آدمی تحقیق کرے کہ مچھر دانی کا نام آدمی دانی یا عورت دانی ہونا چاہئے تھا کیوں کہ یہ آدمی نے

اپنے لئے بنائی ہے۔ بہرحال اس موضوع پر اگر کوئی کاوش میری نظر سے گزری تو ضرور آپ کے گوش گزار کروں گا۔

مچھر دانی کے بعد اس حشرے سے دور رہنے کے لئے coil بنے۔ ان میں دو قسم کے کیمیکل ہوتے ہیں — کیڑے مار زہریلی دوائیں اور ایسی خوش بو جن سے مچھر بھاگتے ہیں۔ کیڑے مار زہریلی دوائیں بعض دفعہ کوائل جلانے والوں کو بھی نقصان پہنچاتی ہیں اس لئے ان کا استعمال اب نہ ہونے کے برابر ہے البتہ دونوں طرح کے کوائل سے اگر دھواں براہِ راست کسی فرد کی ناک میں داخل ہو تو زکام ہوجاتا ہے۔

کوائل سے پیدا ہونے والی مشکلات کو دیکھتے ہوئے بعض کمپنیوں نے الیکٹرک کوائل بنائے جن میں موجود کیمیکل جلنے سے بھینی بھینی خوش بو آتی ہے اور مچھر دور رہتے ہیں۔ اب بجلی کتنی دیر میں آتی ہے اور آتی بھی ہے یا نہیں۔

کوائل اور بجلی سے جلنے والے مچھر مار کے مسائل دیکھتے ہوئے ایسے پودوں کی معلومات آپ تک پہنچانا مطلوب ہے جو خوش نما ہونے کے ساتھ ساتھ خوش بو دار ہیں مگر ان کی خوشبو مچھروں کی برداشت سے باہر ہے۔ یہ پودے گھر کے قریب رکھنے سے مچھر نہیں بھاگتے بلکہ ان کے پتّوں، پھولوں یا پھلوں کو کاٹ یا پیس کر رکھنے سے بھاگتے ہیں۔ کچھ پودے ایسے ہیں جن کے پتّوں کے بارے میں بعض ماہرین کہتے ہیں کہ انہیں ہاتھوں پیروں پر مسلا جاسکتا ہے۔

لیمن گراس: جڑی بوٹیوں سے بنی چائے جسے ہربل ٹی بھی کہتے ہیں، میں لیموں کا مزہ شامل کرنے کے لئے لیمن گراس استعمال کی جاتی ہے۔ اس سے کئی طریقوں سے استفادہ کیا جاسکتا ہے جیسے جِلد کی نرمی کے لئے اس کا لیپ اور ذہنی سکون کے لئے اس کی خوش بو سونگھنا۔ صابن، خوش بویات اور سنگھار کی چیزوں کے علاوہ لیمن گراس سے وٹامن اے بھی حاصل کیا جاتا ہے۔ اگر آپ لیمن گراس کو ان چیزوں میں استعمال نہیں کرتے تو کم از کم اس سے مچھر ضرور بھگا سکتے ہیں۔ ماہرین کہتے ہیں کہ لیمن گراس میں دو ایسے کیمیائی مادے پائے جاتے ہیں جو مچھروں کو بھگانے میں مدد دیتے ہیں۔ لیمن گراس کے پتّے توڑ کر باریک کاٹ لیں یا پیس لیں۔ اس کا پیسٹ مہندی کی طرح جسم کے کھلے حصوں پر ملنے سے مچھر بھاگ جاتے ہیں۔

لیونڈر (اسطوخودّوس): اس کا تیل پیٹ کے کئی مسائل کا حل ہے۔ بعض محققین کے مطابق اس سے فراعینِ مصر اور پہلے کے ادوار میں بھی لوگوں نے استفادہ کیا۔ ان پودوں کے قریب کیڑے نظر نہیں آتے۔ دلکش نیلے پھولوں والے اس پودے کی خوش بو مچھروں اور دیگر کیڑوں کے لئے ناخوش گوار ہے۔ 2002ء میں کی گئی تحقیق کے مطابق مچھر اس کی بو محسوس کرتے ہی بھاگ جاتے ہیں۔ اس کے تیل کی مہک بھی حشرات کے لئے ناگوار ہے۔ طریقہ یہ ہے کہ اسطوخودّوس کے پھول معمولی پیسیں اور مچھروں کو بھگائیں۔

لیمن بام: لیمن گراس کی نسل کا ایک اور پودا لیمن بام مچھروں کے لئے ناقابلِ قبول ہے۔ اس کے نئے پتّوں کی خوش بو پرانے پتّوں سے تیز ہوتی ہے۔ یہ آدمی کے لئے سکون آور ہے۔ خوش بو سے علاج میں اس پودے کی خوش بو سے بھی استفادہ کیا جاتا ہے۔ لیمن بام سے حاصل ہونے والا تیل مختلف دواؤں، شیمپو اور صابن وغیرہ میں استعمال کیا جاتا ہے۔

اب ایسے پودے (درخت) کا ذکر ہے جس کے بارے میں اخبارات میں کافی کچھ لکھا گیا ہے۔ خاص طور پر جب سے ہیٹ ویو میں اضافہ ہوا ہے، گرمی سے بچنے کے لئے جن نباتات کا نام سرِفہرست ہے، ان میں ایک نیم ہے۔

نیم آہستہ بڑھتا ہے۔ گھنا سایہ سخت گرمی میں ٹھنڈک فراہم کرتا ہے۔ نیم کی لکڑی، نبولیاں (پھل)، پھول، پتّے غرضیکہ ہر شے مفید ہے۔

نیم کے پتّوں کو ابال کر اس سے نہانا جِلد کے کئی مسائل کا حل ہے۔ نیم اور کھوپرے کے تیل سے ایک محلول تیار ہوتا ہے جسے جِلد پر ملنے سے مچھر دور رہنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

ان پودوں اور درختوں کے علاوہ جیرینیم (گلِ شمع دانی)، تلسی اور کئی دوسرے پودے مچھروں سے بچاؤ میں مدد دیتے ہیں۔

لیموں اور لونگ سے بھی مچھر دور رہتے ہیں۔ لیموں دو حصے کرکے اس میں لونگ لگادی جائے تو مچھر بھگاؤ شے تیار ہے۔ اگر لہسن کے جَوے آدھے آدھے کاٹ کر اپنے چاروں طرف رکھ لیں تو بھی مچھر دور رہتے ہیں لیکن یہ ٹوٹکے کتنی دیر قابلِ عمل رہتے ہیں، اس کے لئے تجربہ کرنا چاہئے۔ دوسری بات یہ ہے کہ دونوں نسخے کافی قیمتی ثابت ہوسکتے ہیں خاص طور پر جب لیموں

کی قیمت بڑھ جاتی ہے۔

اگر ماحول میں ایسے عوامل موجود نہ ہوں جو مچھروں کو بڑھنے کے مواقع فراہم کرتے ہیں تو اس حشرے پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ مچھر کی بڑی نرسری ٹھہرا ہوا پانی ہے۔ پہلے یہ خیال کیا جاتا تھا کہ مچھر گندے پانی میں پیدا ہوتے ہیں لیکن اب پتہ چلا کہ ڈینگی کے مچھر کی جائے پیدائش صاف پانی ہے۔ کوشش کی جائے کہ پانی اپنے مسکن کے علاوہ کسی جگہ نہ ٹھہرے۔

بعض اوقات باغیچے یا گملوں میں اتنا پانی ڈال دیا جاتا ہے کہ مٹی اسے جذب کرنے میں وقت لیتی ہے۔ ضرورت سے زیادہ پانی پودوں کے لئے نقصان دہ ہے اور مچھروں کے لئے انڈے دینے کی بہترین جگہ ہے۔

پرندوں کے لئے کونڈوں میں رکھا جانے والا پانی روز تبدیل ہونا چاہئے ورنہ یہ بھی مچھروں کی پسندیدہ جگہ بن سکتی ہے۔ اگر ٹینک کھلا رکھا جائے یا پانی کھلی جگہ میں ذخیرہ ہو تو ماہرین کے مشورے سے اس میں ایسے کیمیکل ڈالے جاتے ہیں جو پانی کو زہر آلود کئے بغیر مچھروں کو پنپنے نہیں دیتے۔ کئی نرسری والے تالاب یا پانی کے کھلے ذخیرے میں مچھلیاں پالتے ہیں جو مچھروں کی تعداد بڑھنے نہیں دیتیں۔

مضمون میں دی گئی احتیاطی تدابیر کے ساتھ ساتھ گھر کی کھڑکیوں اور دروازوں میں باریک جالی بِن بلائے مہمانوں کو آنے سے روکتی ہے۔ جن گھروں میں چھوٹے بچے ہوں، وہاں زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے تاکہ مچھر اور دوسرے کیڑے مکوڑے گھر میں داخل نہ ہوں۔

خوش بو کیا ہے ــــ ؟

<u>احتیاط</u>: ٹوٹکا اور کریم جِلد پر آزمانے سے پہلے ایک حصے پر تھوڑا سا لگا کر دیکھنا چاہئے کہ کہیں آپ کو اس سے الرجی تو نہیں۔ اگر جِلد سرخ ہو جائے، خارش ہو یا ابھار پیدا ہو تو وہ شے استعمال نہ کریں۔

مچھروں کو بھگانے والے نباتات کے بارے میں پڑھ کر خوش بو اور بدبو کی تعریف سوالیہ نشان ہے۔ جب خوش بو کسی کے لئے بدبو اور بدبو کسی کے لئے خوش بو ہے تو پھر کس طرح فیصلہ ہوگا کہ آیا یہ خوش بو ہے اور یہ بدبو ہے ــــ ؟ سوال یہ ہے کہ خوش بو سب کے لئے خوش بو کیوں نہیں ــــ ؟

عابد محمود

دو چوڑیاں

گیند تلاش کرتے ہوئے برگد کے درخت کی چھاؤں میں ایک عورت بیٹھی نظر آئی جس کی گردن جھکی ہوئی تھی اور وہ اپنی کلائی میں پڑی چوڑیاں دیکھنے میں مگن تھی۔

کہتے ہیں کہ عورت کی کلائی میں چوڑی مردوں نے پہنائی ہے۔ یہ کبھی اس بات کی علامت تھی کہ عورت کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ ہر چوڑی کسی روایت کی یاددہانی تھی کہ عورت کو مردوں کی بنائی ہوئی روایات کی حفاظت کرنی ہے۔ غلامی کا ذہن قبول کرنے میں نہ جانے کتنے ادوار لگے یہاں تک کہ یہ علامات فیشن بن گئیں۔

میں چھوٹی تھی تو چھابے والے سر پر چھابہ رکھ کر گاؤں گاؤں گھومتے تھے اور بنجارنیں چوڑیوں کا چھابہ اٹھائے گھر گھر چوڑیاں بیچتی تھیں۔ رفتہ رفتہ چھابوں نے چھوٹی بڑی دکانوں کی شکل اختیار کرلی۔ چمکتی دمکتی چوڑیوں کے پیچھے خواتین و مرد اور بچوں کی مشقت ہے۔ کلائی میں کھنکنے والی ہر چوڑی بازار پہنچنے سے پہلے کئی مراحل اور متعدد ہاتھوں سے گزرتی ہے۔

کچھ ساز مدھ بھری موسیقی ہیں جب کہ ساز ایسے بھی ہیں جو بے ہنگم ہوتے ہیں۔ چوڑی کی کھنک بھی سازوں میں ایک ساز ہے، شعرا نے اس پر کلام لکھا ہے تاہم ایسے بھی لوگ ہیں جن کو چوڑی کی کھنکناہٹ شور محسوس ہوتی ہے۔

سننے والے کہتے ہیں کہ شور صرف چوڑیوں کا نہیں ہوتا بلکہ اندر موجود روایات کا بھی ہوتا ہے۔ جب ضمیر اور روایات کی چوڑیاں ٹکراتی ہیں تو شور برپا ہو جاتا ہے۔

چوڑی پاڑہ ـــ شہر سے دور چوڑی سازوں کا محلہ ہے جہاں صنعتیں اور چوڑی سازی کے مراکز ہیں۔ تنگ اور گنجان آباد گلیوں پر مشتمل یہ محلہ پہلے گاؤں ہوا کرتا تھا جو مختصر ہو کر محلہ رہ گیا۔ میری دلچسپی کا محور ہائی اسکول چوڑی پاڑہ تھا جہاں میڈم قدسیہ پڑھاتی تھیں۔ وہ خوب صورت

اور اچھی سیرت کی مالک تھیں۔ ان کی جھیل سی آنکھوں میں ڈوبنے کو جی چاہتا تھا۔

میڈم قدسیہ کی جمیل نامی شخص سے محبت کی داستان گاؤں میں مشہور تھی۔ سنا تھا کہ وہ بیرون ملک گیا تو پھر پلٹ کر نہیں آیا۔ اس کی وجہ سے میڈم نے شادی نہیں کی۔ وہ کہتی تھیں کہ دل ایک بار ہی کسی پر آتا ہے۔ جمیل کی طرح میڈم قدسیہ بھی سائیں دتہ کی مرید تھیں۔ گاؤں کا ہر فرد ان کا عقیدت مند تھا۔ جب میں پیدا ہوئی تو اس کے دو سال بعد سائیں دتہ کا وصال ہوا۔

ہم بچوں کے سوال پر کہ آپ خاموش کیوں رہتی ہیں، میڈم نے کہا، سائیں دتہ کہتے تھے کہ کم کھانا، کم سونا اور کم بولنا فقیروں کا شیوہ ہے۔ اس لئے میں ضرورت کے تحت بات کرتی ہوں ورنہ خاموش رہتی ہوں۔ میں نے فوراً کہا، میں بھی آپ کی طرح کم گو ہوں، کبھی کبھی بات کرتی ہوں۔ میڈم قدسیہ کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔ انہوں نے کہا، اچھا یہ بتاؤ کہ کیا زبان سے خاموش رہنا کم گوئی ہے؟

میں نے حیرت سے پوچھا، زبان کی خاموشی کم گوئی نہیں تو پھر کم گوئی کیا ہے؟

میری کلائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ بولیں، دیکھو! تمہاری چوڑیاں کتنا شور کرتی ہیں۔ زبان خاموش ہے تو کیا ہوا، چوڑیوں کی کھنک بھی کبھی رکی ہے؟

چوڑی پاڑہ کے گرد لہلہاتے کھیت اور بل کھاتی پگڈنڈیاں تھیں۔ کھیتوں کے وسط میں تالاب تھا جس کے کنارے سائیں دتہ کا مزار تھا جہاں ہر سال ویساکھ کا میلہ لگتا تھا۔ لوگ دور دور سے اولاد کے لئے دعائیں مانگنے آتے تھے۔ والدین بچوں کو پیدائش کے بعد مزار پر لے جاتے جہاں لڑکے کے گلے میں اللہ کے نام کی مالا اور لڑکی کی کلائی میں ایک چوڑی ڈالی جاتی تھی۔ کانچ کی چوڑیاں گاؤں کی روایت تھی۔ ان کی کھنک سن کر مردوں کی نگاہیں نیچی ہو جاتی تھیں۔

سائیں دتہ کے مزار کے باہر تختی تھی جس پر حضرت علامہ اقبالؒ کا شعر کندہ تھا،

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں ۔۔۔ لا الٰہ الا اللہ

میں شعر پڑھ کر معنی سمجھنے کی کوشش کرتی۔ ایک دن شعر لفظ بہ لفظ اپنی تختی پر لکھا کہ میڈم سے مطلب پوچھوں گی۔ انہوں نے شعر پڑھا تو آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

وہ بولیں، یہ کہاں سے لکھ کر لائی ہو؟

میں نے کہا، سائیں دتہ کے مزار کے باہر تختی پر لکھا ہوا ہے، اس کا مطلب کیا ہے؟

وہ نمی چھپاتے اور خلا میں نگاہیں جماتے ہوئے خود کلامی کے انداز میں بولیں، جمیل کہتا تھا کہ سارا جہاں عشق و محبت کی داستان ہے۔ یہاں پر عشق اور ایثار کے علاوہ کچھ نہیں۔ ایک لافانی قوت ہے جو ہر دم ہماری کفالت کرتی ہے۔ عشق میں نوازشیں شرط نہیں لیکن ہم پر طرح طرح کی نعمتوں اور نوازشوں کی بارش جاری ہے جسے ہر کوئی الگ الگ زاویے سے دیکھتا ہے۔ ہر فکر اور ہر سوچ ایک زاویہ ہے۔ اجتماعی زاویہ شکر گزاری اور بندگی کا احساس پیدا کرتا ہے جب کہ انفرادی زاویہ ہر نعمت کو بت بنا دیتا ہے۔ بت توڑے بغیر کوئی فرد بت شکن نہیں ہوتا۔

میں نے نہ سمجھنے والے انداز میں دیکھا تو وہ بولیں، ابا کہتے تھے کہ میں سائیں دتہ کی دعا سے پیدا ہوئی۔ ابا مجھے ان کے پاس لے گئے تو انہوں نے میرے ہاتھوں میں اللہ کے نام کی ایک چوڑی پہنائی۔ میں بڑی ہوئی تو کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی بہانے سے سائیں دتہ کے مزار سے ایک چوڑی مجھ تک پہنچتی رہی۔

میری نظر فوراً ان کے ہاتھوں کی طرف گئی اور وہ چوڑی تلاش کی جو سائیں دتہ نے پہنائی تھی۔ انہوں نے سرخ رنگ کی چوڑی کی طرف اشارہ کیا۔ پھر دوسری کلائی کی ایک چوڑی سے کھیلتے ہوئے بولیں کہ یہ جمیل نے دی تھی۔

اور باقی چوڑیاں کہاں سے آئیں؟

میں نے بے ساختہ پوچھا۔

ان کی آنکھوں سے پانی کا قطرہ دھار بن کر گالوں پر بہہ گیا۔ کچھ کہنا چاہتی تھیں لیکن آواز نے ساتھ نہیں دیا۔ بالآخر خود پر قابو پاتے ہوئے بولیں، باقی چوڑیاں خود غرضی، ہوس، ملکیت، لالچ اور حرص کی ہیں جو میں نے خود پہنی ہیں۔ ان کا شور بہت بے چین کرتا ہے۔ یہ میرے بنائے ہوئے بت ہیں جو آپس میں لڑتے ہیں۔ سائیں دتہ کہتے تھے کہ جو شخص اپنے بنائے ہوئے بت پہچان کر ان کو توڑنے کی ہمت رکھتا ہو، اسے بت شکن کہتے ہیں۔

جس روز میڈم اسکول نہیں آتی تھیں، ہمارا پڑھائی میں دل نہیں لگتا تھا۔ ہم سبق نہ پڑھنے کے بہانے تلاش کرتے اور مزار کے باہر تالاب کنارے کھیلنے پہنچ جاتے۔ لکن چھپی، گلّی ڈنڈا،

شٹاپو یہاں تک کہ گیند بلّے سے کھیل کھیلتے۔ آج وہ اسکول نہیں آئیں تو ہم بھی باہر آ گئے۔

مزار کے قریب کھوکھے دکانیں بن گئی تھیں۔ آلو نان، پکوڑے، بیسن کی روٹی، گنڈیریاں اور مصنوعی زیورات کی دکان جس میں لاکٹ اور چوڑیاں سب مل جاتی تھیں۔ میں اکثر اس دکان پر جاکر چوڑیاں دیکھتی تو میڈم قدسیہ کی باتیں ذہن میں گردش کرتیں۔

نمرہ چوڑیاں خرید رہی تھی۔ اس کی کلائی میں پہلے سے موجود درجن بھر چوڑیاں دیکھ کر پوچھا، نمرہ! تم کھنکھناہٹ سے پریشان نہیں ہوتیں؟

ہنستے ہوئے شوخی سے کہا، تم بھی میڈم کی طرح چوڑیوں کے پیچھے پڑ گئیں، میری تو پوری زندگی چوڑیوں سے جڑی ہوئی ہے۔ گھر جاؤ تو چوڑیاں بنتے دیکھو، یہاں آؤ تو فروخت ہوتے دیکھو۔

نمرہ کی بات سن کر میں نے کچھ سوچتے ہوئے سنجیدگی سے کہا، میڈم صحیح کہتی ہیں کہ چوڑیاں بہت شور کرتی ہیں۔

نمرہ اپنے بھائی کا گیند اور بلّا لائی تھی۔ لکن چھپی کے بعد ہم نے کرکٹ کھیلی۔ نمرہ نے بلّا گھمایا تو گیند ہوا میں لہراتی ہوئی سیدھی سائیں دتہ کے مزار کے احاطے میں گری۔

نمرہ نے آواز دی، حور بانو! گیند لے کر آؤ۔

میں بھاگتے ہوئے مزار کے اندر گئی اور گیند تلاش کرنے لگی۔ جس زور سے نمرہ نے بلّا گھمایا تھا، میرا خیال تھا کہ گیند مزار کے احاطے میں گر کر تربت کے آس پاس گئی ہوگی۔

گیند تلاش کرتے ہوئے برگد کے درخت کی چھاؤں میں ایک عورت بیٹھی نظر آئی جس کی گردن جھکی ہوئی تھی اور وہ اپنی کلائی میں پڑی چوڑیاں دیکھنے میں مگن تھی۔ وہ کچھ لمحے رک کر کلائی کو کبھی آہستہ اور کبھی تیزی سے ہلاتی تھی جس سے چوڑیوں کی کھنکھناہٹ گونجنے لگتی۔

میں اس پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے تربت کے پاس گیند تلاش کرنے لگی۔ گیند نہیں ملی۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے برگد کے درخت کے پاس پہنچی تو شناسا چہرہ دیکھ کر حیران رہ گئی۔

وہ عورت کوئی اور نہیں، میڈم قدسیہ تھیں جو گردوپیش سے غافل اپنی خوب صورت کلائی میں چوڑیاں دیکھنے میں مگن کبھی مسکراتی تھیں، کبھی چہرہ جذبات سے عاری ہو جاتا تھا۔

میدے جیسا رنگ، جھیل سی گہری آنکھیں، آنکھوں میں خمار سے بھرپور لال ڈورے، سر پر

دوپٹہ بھلا لگ رہا تھا۔ ان کا خوب صورت چہرہ اور کلائیوں میں درجن بھر چوڑیاں سب دیو مالائی داستان سنا رہے تھے۔

قریب جاکر متوجہ کرنا چاہا کہ اگلے منظر نے چونکا دیا۔ وہ ایک ایک کرکے چوڑی توڑ رہی تھیں۔ چوڑی ٹوٹتے ہی ہاتھ پر خون ابھر آتا مگر وہ تکلیف سے بے نیاز تھیں۔ پہلے کلائی ہلاتیں پھر کھنکھناہٹ سنتیں اور اس کے بعد زور سے ایک چوڑی دباتیں اور توڑ دیتیں۔ جب آخری چوڑی رہ گئی تو دوبارہ کلائی ہلائی مگر اس مرتبہ کھنکھناہٹ کی آواز نہیں آئی۔

وہ جیسے مطمئن ہوگئیں کہ انہوں نے ساری زنجیریں توڑ دی ہیں۔ سر برگد کے تنے سے لگا کر آنکھیں بند کرنا چاہیں تو ان کی نظر مجھ پر پڑی۔

میں دم بخود کھڑی یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ ان کو اپنی طرف متوجہ پاکر تیزی سے آگے بڑھی، دوپٹے کا پلّو پھاڑا اور زخمی ہاتھ پر باندھا۔

یہ آپ نے کیا کیا—؟

انہوں نے میری طرف دیکھے بغیر جواب دیا، دیکھ حور بانو! میں نے چوڑیاں توڑ دی ہیں۔ ہر بت توڑ دیا ہے۔ اب کوئی شور نہیں۔

انہوں نے میری طرف دیکھے بغیر کلائی ہلائی جیسے بتانا چاہ رہی ہوں کہ دیکھو! کھنکھناہٹ ختم ہوگئی ہے۔ دونوں کلائی میں ایک ایک چوڑی رہ گئی تھی اور کوئی آواز نہیں تھی۔

میں نے پوچھا، دو چوڑیاں کیوں رہنے دیں؟ یہ کون سے بت ہیں جو آپ سے نہیں ٹوٹے؟

کچھ لمحوں کے لئے وہ چونکیں پھر بولیں، یہ بت نہیں— یہ امید ہیں زندہ رہنے کی۔ ایک چوڑی سائیں دتہ نے بچپن میں پہنائی تھی اور دوسری جمیل نے دی تھی۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا، بت شکنی یہ ہے کہ امید کی امید بھی چھوڑ دی جائے۔ آپ نے دو بت رہنے دیئے— میری نظر میں اتنے بت توڑنے کے بعد بھی آپ بت پرست ہیں۔

اتنے میں باہر سے نمرہ کی آواز آئی، کہاں رہ گئیں حور بانو؟ ساتھ موجود دوسری سہیلی نے کہا کہ چلو! اندر چل کر دیکھتے ہیں۔

اس سے پہلے کہ وہ اندر آتیں اور میڈم کو اس حال میں دیکھتیں، میں نے گیند اٹھائی اور تیزی سے مزار کے احاطے سے باہر آگئی۔

باہر نکلنے سے پہلے پلٹ کر دیکھا۔

سائیں دتہ نے بچپن میں بت شکنی کے جس "راز" کو چوڑی بنا کر میڈم قدسیہ کو دیا تھا، وہ راز کی فہم کے اس مرحلے پر آپہنچی تھیں کہ ان کو بتوں کی پہچان ہوگئی تھی۔

وہ کلائی میں رہ جانے والی آخری دو چوڑیاں توڑ رہی تھیں۔ انہوں نے جمیل کی فانی محبت کی یادوں سے آزاد ہونے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی سائیں دتہ کے اس پیغام کو بھی سمجھ لیا تھا کہ کسی کی پہچان کو جسم کی پہچان تک محدود رکھنا بت پرستی کی علامت ہے۔ آخری چوڑیاں توڑ کر وہ مادی بندھن سے آزاد ہوگئی تھیں۔

میں یہ دیکھ کر مسکرا دی اور تیزی سے باہر کی جانب قدم بڑھادیئے۔

دل جب تک جسم کا غلام ہے — فریب میں الجھا رہتا ہے۔ کبھی اسے چوڑی منزل نظر آتی ہے اور کبھی وہ کلائی جس نے چوڑی پہنی ہے۔

کانچ کی چوڑیوں سے آزاد کلائیاں دیکھ کر میرے اندر میں سکون اتر گیا، یہ سوچ کر کہ اب قلب کا سفر شروع ہوگا اور میڈم قدسیہ کی مراد پوری ہوجائے گی۔

چوڑیاں کبھی قید کی علامت تھیں — رفتہ رفتہ سنگھار کا حصہ بن گئیں۔ تقریبات میں پہنی جاتی ہیں۔ طوطیِ ہند حضرت امیر خسروؒ نے شادی بیاہ کے ایک گیت میں چوڑیوں کا ذکر کیا ہے۔

میرے نیہر سے آج مجھے آیا
یہ پیلا جوڑا یہ ہری ہری چوڑیاں

کانسی کا دور ہو، تانبے یا سونے کا، چوڑیوں کے آثار ہر دور کی باقیات سے ملے ہیں۔ صوبہ سندھ کے تاریخی شہر موئن جو دڑو (2600ق۔م) کے کھنڈرات سے دریافت ہونے والی معروف مورتی جس میں لڑکی رقصاں ہے، کی بائیں کلائی پر چوڑی ہے۔ قدیم شہر ٹیکسلا کے کھنڈرات سے سونے کی چوڑیاں ملیں۔ بھارت میں ناگپور کے قریب مہور جھری کے آثار قدیمہ سے تانبے کی چوڑیاں دریافت ہوئیں جب کہ موریا سلطنت (185-322ق۔م) کے دور کی چوڑیاں نقش و نگار سے مزین ہیں۔ آج زیادہ تر کانچ اور پلاسٹک سے تیار کی جاتی ہیں۔

چوڑیوں کی صنعت چھوٹی یا گھریلو صنعت میں شمار ہوتی ہے۔ پاکستان میں حیدرآباد چوڑیوں کی گھریلو صنعت کا مرکز ہے۔

اقتباسات

"ماہنامہ قلندر شعور" کو گلدستہ بنانے کے لئے قارئین کی کوشش قابلِ قدر ہے۔ قرآن کریم، آسمانی کتابوں، ملفوظات، تاریخ، انکشافات اور سائنسی فارمولے بھیج کر اس رسالے کا حصہ بن سکتے ہیں۔ تحریر کم و بیش 120 الفاظ پر مشتمل ہو۔

انسان اپنی پوری صلاحیتوں کے ساتھ تن من دھن سے کسی چیز کی تلاش میں لگ جائے اور تلاش کو زندگی کا مقصد قرار دے دے تو اسے کامیابی حاصل ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ہے، پہلے بھی جاری تھی، اب بھی جاری ہے اور آئندہ بھی جاری رہے گی۔ اس بات کو ہمارے بزرگوں نے دو لفظوں میں بیان کیا ہے، جوئندہ پائندہ — جو ڈھونڈتا ہے، وہ پالیتا ہے۔ (مرسلہ: شفق جاوید۔ برمنگھم، کتاب: محبوب بغل میں)

شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں کہ نوشیرواں عادل کے خادم شکار گاہ میں شکار کئے ہوئے جانور کے کباب بنانے لگے مگر نمک موجود نہ تھا۔ ایک خادم کو قریب ایک گاؤں کی طرف نمک لینے کے لئے بھیجا۔ نوشیرواں نے کہا، نمک قیمت ادا کر کے لانا تاکہ رسم نہ پڑ جائے اور یہ گاؤں برباد نہ ہو جائے۔ کسی نے پوچھا، معمولی مقدار میں نمک سے گاؤں کیسے برباد ہو گا؟ نوشیرواں نے کہا، دنیا میں ظلم کی بنیاد پہلے پہل تھوڑی تھی، بعد میں آنے والوں نے اس میں اضافہ کیا۔ شیخ سعدیؒ مزید فرماتے ہیں کہ بادشاہ انصاف پسند ہو تو معاشرے میں بگاڑ پیدا نہیں ہوتا کیوں کہ عدل و انصاف معاشرے میں امن و سکون قائم کرتا ہے۔ اگر بادشاہ عادل نہ ہو، وہ ناانصافی سے کام لے تو باقی لوگ بادشاہ سے بڑھ کر ظلم و ستم اور ناانصافی کریں گے۔ (مرسلہ: ماریہ خالد۔ اسلام آباد، کتاب: گلستانِ سعدیؒ)

کراچی کے باشندوں کو غیر ملکی سیر و سیاحت پر اکسانے میں آب و ہوا کا بڑا دخل ہے۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ انگلستان کا موسم اگر اتنا ظالم نہ ہوتا تو انگریز دوسرے ملکوں کو فتح کرنے ہر گز نہ نکلتے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ محض میری صحت دیکھ کر یہاں کی آب و ہوا سے بدظن ہو جائیں لیکن اطلاعاً اتنا عرض ضرور کروں گا کہ مقامی چڑیا گھر میں جو بھی نیا جانور آتا ہے، کچھ دن یہاں کی بہارِ جاں فزا فضا دیکھ کر میونسپل کارپوریشن کو پیارا ہو جاتا ہے اور جو جانور بچ جاتے ہیں، ان کا تعلق اس مخلوق سے ہے جن کو طبعی موت مرتے کم از کم میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ مثلاً ہاتھی اور مگر مچھ۔ ہم نے کراچی کے ایک باشندے سے پوچھا کہ یہاں مون سون کا موسم کب آتا ہے—؟ اس بزرگ باراں دیدہ نے نیلے آسمان کو تکتے ہوئے جواب دیا کہ چار سال پہلے تو بدھ کو آیا تھا۔ (مرسلہ: عابد قیوم ۔ لاہور، کتاب: چراغ تلے)

روزمرہ زندگی میں یہ بات مشترک ہے کہ مناظر کو دیکھتے وقت یا مناظر کے عکس کو محسوس کرتے وقت مادی آنکھوں کا عمل دخل صفر ہوتا ہے۔ بتانا یہ مقصود ہے کہ انسانی نگاہ اپنے عمل میں مادی عوامل کی احتیاج سے آزاد ہے۔ ایک طرز میں وہ مادی آنکھ کے وسیلے سے حرکت کرتی ہے۔ دوسری طرز میں اس کا عمل مادی آنکھوں کے عمل سے ماوراہے۔ وہ رخ جو مادی آنکھ کے بغیر کام کرتا ہے— باطنی نگاہ، اندرونی نظر یا دیدِ دوست ہے۔ روحانی علم کی روشنی میں آدمی کی تعریف بیان کی جائے تو اسے نگاہ کا نام دیا جائے گا اور نگاہ کا دارو مدار اطلاعات پر ہے۔ اطلاعات ذہن میں آتی ہیں اور نگاہ بن جاتی ہیں۔ (مرسلہ: وجاہت ذوالفقار ۔ متحدہ عرب امارات، کتاب: الستُ بربکم)

مٹی کی صورتیں ہمیں پکار پکار کر کہہ رہی ہیں، "اے آدم زاد! تو کیوں خود فراموشی کے جال میں گرفتار ہے—؟ یہ سب مٹی ہے جو ٹوٹ کر، بکھر کر، ریزہ ریزہ ہو کر نئے نئے روپ میں جلوہ گر ہو رہی ہے۔ تو کیوں مٹی کے سامنے شکست خوردہ نہیں ہو جاتا؟ اس شکست میں تیرے لئے سعادت ہے کہ کبر و نخوت سے بچ جائے گا۔" (مرسلہ: مدیحہ سبحان، کینیڈا، کتاب: کشکول)

عرفانہ شہزاد

سنا کِس نے

”گملے ترتیب سے رکھنے کے بعد پودوں کو پانی دیتے وقت تصور کریں کہ اللہ آپ کو دیکھ رہا ہے۔ خیال رہے کہ ہر پودا ایک شعور ہے اور آپ ان کے شعور سے سیراب ہو رہے ہیں۔“

حیات آغاز سے انجام تک خیال پر قائم ہے۔ آدمی خیال کے ارتعاش کو جس حد تک محسوس کرتا ہے، وہ اس کا مشاہدہ بن جاتا ہے۔

خیال خالص ہو یا اس میں تحریف کر دی گئی ہو، یہ وہ کرنٹ یا قوت ہے جو فرد کے اندر جاری ارتعاش کو اپنے سانچے میں ڈھال لیتا ہے۔ خیال ایک مکمل علم ہے اور علوم کے مظاہرے کا میڈیم بھی۔ حقیقت تک رسائی، کلامِ الٰہی کی لطافت اور گہرائی کا فہم اس امر پر منحصر ہے کہ فرد خیال کے علم سے کتنا واقف ہے۔ ذہن نشین رہے کہ خیال کا عکس ہو بہو اس دماغ پر جگمگاتا ہے جس میں پہلے سے کوئی چھاپ نہ ہو۔ بزرگ راہ نما کی بات یاد آئی۔ انہوں نے ایک مرتبہ فرمایا،

”میری سلیٹ خالی تھی، مرشد نے جو کہا، اس پر نقش ہو گیا۔“

خیال سے جو مفہوم اخذ کیا جاتا ہے، وہی مشاہدہ بنتا ہے اور مشاہدہ نقش ہے۔ اگر مفہوم لاشعور کے مطابق نہ ہو تو مشاہدہ معتبر نہیں۔

روحانی استاد سکھاتے ہیں کہ ہر حال اور ہر قال میں قلب کی اسکرین کو الوژن سے پاک رکھو۔ طریقہ یہ ہے کہ قلب استاد کی جانب متوجہ رہے۔ استاد کا قلب اللہ کی نشانیوں میں مرکوز ہوتا ہے۔ ذہن ہم رنگ ہونے سے استاد کی طرز فکر سالک کو منتقل ہوتی ہے اور وہ نسبت ملتی ہے جو علمِ حضوری کے لئے ضروری ہے۔

ایک روز بزرگ راہ نما وضو کر کے اٹھے تو خود کلامی کے انداز میں گویا ہوئے،

”کوئی نہیں پوچھتا کہ بھائی، کون ہو تم۔“

برسوں پہلے سنے گئے اس جملے کی آج بھی اندر

میں گونج ہوتی ہے۔

ایک صاحب کو دفتر میں سنگین صورتِ حال کا سامنا ہوا۔ وہ حاضر ہوئے تو راہ نما نے حل تجویز کرنے کے ساتھ فرمایا،

"ایسا معاملہ ان لوگوں کے ساتھ پیش آتا ہے جن کی پیدائش کے وقت والدہ بیمار ہوں۔"

بات میرے علم میں آئی تو میں ششدر رہ گئی کیوں کہ میری پیدائش کے فوراً بعد والدہ بیمار ہو گئی تھیں، ان کو فالج ہوا تھا۔

ایسے واقعات بھی ہیں کہ کوئی شخص بیماری کی سختی سے گزرا تو بزرگ راہ نما نے علمِ رُویا کے تحت خواب میں آ کر مسیحائی فرمائی اور مریض شفایاب ہوا۔ ان تجربات سے گزرنے والوں کے اندر یقین کا پیٹرن متحرک ہو جاتا ہے۔

پاکیزہ نفوس کا فیض کسی مخصوص فرد یا خطے کی جغرافیائی حدود کا پابند نہیں، ہر فرد اور مخلوق اس سے فیض یاب ہو سکتی ہے اور ہوتی ہے۔

علمِ حضوری کے حامل خواتین و حضرات کوئی وظیفہ تجویز کرتے ہیں تو اسے پڑھنے سے اندر میں ارتعاش پیدا ہوتا ہے جو مقداروں کی کمی بیشی کو متوازن کر کے مسائل کو بخوبی حل کرنے کا یقین پیدا کرتا ہے۔ یقین سے منزل تک جانے کے راستے کھلتے ہیں اور ذہن اس قابل ہو جاتا ہے کہ شعور، لاشعور کا پرنٹ قبول کرے۔

خانقاہ میں مرکزی تقریب تھی۔ خدمات پیش کرنے والوں کی فہرست میں میرا نام بھی تھا۔ یہ میری پہلی ڈیوٹی تھی۔ راہ نما سے ملاقات ہوئی تو دیکھتے ہی فرمایا، آپ مالی بابا کے پاس جائیں اور ان کے ساتھ مل کر باغبانی کا کام انجام دیں۔

ڈیوٹی کا تعین ہوتے ہی محسوس ہوا کہ عمل کا میدان کشادہ کر دیا گیا ہے۔ مالی بابا کے ساتھ کام کرنے بیٹھی تو انہوں نے بتایا کہ جب میں نے یہاں باغبانی شروع کی تو راہ نما نے مجھ سے کہا،

"گملے ترتیب سے لگانے کے بعد پودوں کو پانی دیتے وقت تصور کریں کہ اللہ آپ کو دیکھ رہا ہے۔ خیال رہے کہ ہر پودا ایک شعور ہے اور آپ ان کے شعور سے سیراب ہو رہے ہیں۔"

کام کے دوران گفتگو سے اجتناب کا حکم تھا۔

مالی بابا باغبانی میں مصروف ہو گئے اور میں یہ سوچ کر مسکرا دی کہ خانقاہ کے گوشے گوشے میں علم کا دریا بہہ رہا ہے۔ میں نے بھی حکم کی تعمیل کی—لطیف احساسات کا مشاہدہ ہوا۔

کام مکمل ہونے پر میں نے سمجھا کہ ڈیوٹی ختم ہو گئی ہے، دوسرے شعبے میں خدمات انجام دینے ورکشاپ کمیٹی کے دفتر پہنچی تو انہوں نے مجھے اپنی ٹیم کا حصہ بنا لیا اور ایک کارڈ دیا جسے میں نے گلے میں ڈال لیا۔

وہاں سے واپسی پر ایک مرتبہ پھر راہ نما سے ملاقات ہوئی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی فرمایا،

آپ کیا بن گئیں؟

یہ فرما کر وہ آگے بڑھ گئے۔

میں وہیں کھڑی رہ گئی۔

دل نے کہا، تم یہاں کچھ بننے نہیں آئی تھیں۔ تمہارا مقصد صرف تعمیلِ حکم ہے۔

گلے میں پڑا ہوا کاغذی کارڈ مجھے منوں وزنی محسوس ہوا جسے میں نے فوراً اتار دیا۔

باغبانی اور روحانی ورکشاپ، دونوں کام ایک ہی تقریب کی تیاری سے متعلق تھے لیکن یہاں تعمیلِ حکم کی اہمیت تھی کہ جو ڈیوٹی براہِ راست ملی، وہ چھوڑ کر دوسری جگہ کیوں گئی۔

دل بھاری ہو گیا۔

فوراً جا کر ورکشاپ کمیٹی کو کارڈ واپس کیا اور باغبانی کا کارڈ گلے میں ڈالا مگر دل پر اب بھی بوجھ تھا۔ چاہتی تھی استادِ محترم دیکھ لیں کہ میں اپنی ڈیوٹی پر لوٹ آئی ہوں۔ خواہش پوری ہوئی اور ہجوم کے باوجود دوبارہ ملاقات ہو گئی۔

میرے گلے میں باغبانی کمیٹی سے منسلک کارڈ دیکھ کر تبسم فرماتے ہوئے کہا،

اب ٹھیک ہے۔

سوچتی ہوں کہ قدرت کتنی فیاض ہے۔ آدمی کو غلطی کی تلافی کے مواقع فراہم کرتی ہے ورنہ احساسِ جرم سوہانِ روح بن جاتا ہے۔

راہ نما خیال کے ذریعے طالب علموں کو تربیتی مراحل سے گزارتے ہیں۔ ہم ان کی مرضی میں اپنی مرضی شامل کر کے اپنے لئے مشکلات جمع کر لیتے ہیں۔ انحراف کی صورت میں اندر میں لطیف ارتعاش (ضمیر) خبردار کرتا ہے جسے ہم وہم سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں جب کہ ہمیں علم ہونا چاہئے کہ ارتعاش کی ڈور کسی اور کے ہاتھ میں ہے۔ کوئی ہے جو ہمیں غلطی کا احساس دلا رہا ہے۔

جب میں چھوٹی تھی تو خواب دیکھا تھا کہ اپنے کمرے میں محوِ استراحت ہوں، چاند کی کرنیں

ہر سو پھیلی ہوئی ہیں۔ غیب سے ڈھیروں ڈھیر کتابیں آرہی ہیں اور بستر کے قریب پانچ سے چھ فٹ اونچی کتابوں کی دیوار بن رہی ہے۔

یہ منظر دیکھ کر دہشت طاری ہوئی اور میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ پیشانی پر پسینے کے قطرے تھے۔

سال ہاسال خواب یاد آتا رہا۔ سوچتی تھی کہ کتابیں تو علم ہیں۔ کوئی علم سے بھی ڈرتا ہے؟ میں خوفزدہ کیوں ہوئی؟

جن دنوں قوتِ مشاہدہ پر غور و فکر جاری تھا، عقدہ کھلا کہ جس زمانے میں خواب دیکھا تھا، میرا ناپختہ شعورعلم کا ارتعاش برداشت نہ کر سکا۔ ننھا بچہ اخبار کے صفحے پلٹنے سے ڈر جاتا ہے، میں بھی ڈر گئی تھی۔ جب علم کی پیاس بڑھی تو تشنگی دور کرنے کے لئے اللہ نے وسیلہ بنادیا۔

مرید جب مراد کا تصور کرتا ہے تو یاد کرنے کو اپنا فعل سمجھتا ہے حالاں کہ وہ حصار میں ہوتا ہے۔ ایک صاحب موٹر سائیکل پر جارہے تھے۔ رفتار تیز تھی۔ ٹرک ان کے اوپر سے گزر گیا۔ لوگ جمع ہوئے اور شور مچ گیا— مرگیا، مرگیا۔ ٹرک گزر گیا تو دیکھنے والوں نے دیکھا کہ موٹر سائیکل زمین پر پڑی ہے اور سوار اپنے کپڑے جھاڑ رہا ہے، ایک خراش نہیں تھی۔

لوگ حیرت زدہ رہ گئے۔

یہ صاحب راہ نما سے ملنے خانقاہ جارہے تھے۔ خانقاہ پہنچنے پر راہ نما کو دروازے پر موجود پایا۔

فرمایا، گاڑی آئندہ احتیاط سے چلانا۔

روحانی استاد اپنے شاگردوں کو خطرات سے بچاتے ہیں اور کوتاہیوں کی نشاندہی فرماتے ہیں۔ جب شاگرد یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کی نگرانی ہو رہی ہے تو ذہن نقصان پہنچانے والی عادتوں سے دور ہو جاتا ہے۔

میرے والد صاحب، اللہ انہیں غریقِ رحمت فرمائے، اکثر جھوم جھوم کر یہ شعر پڑھتے تھے۔

سبھی پھل درختیں لگدے کچّے ہون یا پکّے
پیر مرید دے سِر اُتے رہندا جھوٹے ہون یا سچّے

ترجمہ: کچے پکے سارے پھل درخت پر لگتے ہیں۔ پیر درخت کی مانند ہے۔ وہ مرید کی نگرانی کرتا ہے، چاہے مرید پھل کی طرح کچا ہو یا پکا۔

کچھ خواتین و حضرات اپنے یقین کے لئے اللہ کے دوستوں کو آزماتے ہیں — ایسا نہیں کرنا چاہئے۔ آزمانے کے خیال کی وجہ شک ہے اور شک بھول بھلیوں کا راستہ ہے۔

ایک صاحبہ سے ان کے نانا جان نے پوچھا، کیا تمہارے راہ نما میرے بارے میں جانتے ہیں؟

ان صاحبہ نے اِٹھلاتے ہوئے کہا، وہ ہمارے دوستوں کے دوستوں کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ اس مناسبت سے وہ آپ کے بارے میں ضرور جانتے ہیں۔ نانا خاموش ہوگئے۔

خاتون نے رات خواب میں دیکھا کہ راہ نما ان کے نانا کے قریب کھڑے ہیں اور سر پر شفقت سے ہاتھ رکھتے ہوئے نام سے پکارتے ہیں لیکن نام کا آخری حصہ کچھ اور تھا۔

صبح خوشی خوشی نانا کو خواب سناتے ہوئے کہا کہ راہ نما نے آپ کا نام لیا لیکن آخری حصہ آپ کے نام سے مختلف تھا۔

خواب سن کر نانا چونک گئے پھر کھوئے ہوئے انداز میں جواب دیا، بیٹی! دراصل نام کا آخری حصہ وہ ہے جو میری پیدائش کے بعد بننے والی پہلی پرچی پر لکھا گیا۔ بعد میں نام کا یہ حصہ بدل دیا گیا۔ اللہ کے دوستوں کے کسی عمل کو غلط نہ سمجھنا ورنہ یقین، بے یقین ہوجائے گا۔

روحانی بندے سے بات کرکے سکون ملتا ہے کیوں کہ وہ مخاطب کے ان تاروں کو تحریک دیتا ہے جن کا براہِ راست تعلق قلب سے ہے۔

ایک وقت تھا کہ ہم ناقابلِ تذکرہ شے تھے۔ عالمِ ارواح میں روح پھونکنے کے عمل سے قابلِ تذکرہ ہوئے مگر جنت میں نافرمانی سے پھر ناقابلِ تذکرہ ہوگئے۔ جب تک آدمی اپنی حقیقی شناخت سے واقف نہیں ہوتا، وہ ظالم اور جاہل ہے۔

"ہم نے اس امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کو پیش کیا تو وہ اسے اٹھانے کے لئے تیار نہ ہوئے اور اس سے ڈر گئے مگر انسان نے اسے اٹھالیا۔ بے شک وہ ظالم اور جاہل ہے۔"

(الاحزاب : ۷۲)

خودشناسی کا مطلب قابلِ تذکرہ ہونا ہے اور خود سے واقفیت ایسی ہستی کی نگرانی میں ہوتی ہے جو اللہ کے حکم سے فی الارضِ خلیفہ کے منصب اور اس نظام سے متعلق امور سے واقف ہوتا ہے۔ جس طرح قطرۂ آب کے بغیر سیپ کے اندر سچے موتی کی نشوونما نہیں ہوتی، اسی طرح راہ نما کے بغیر آدمی اندر میں جوہر سے واقف نہیں ہوتا۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے،

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، تقویٰ اختیار کرو اور اس تک پہنچنے کے لئے وسیلہ تلاش کرو۔" (المآئدۃ : ۳۵)

Manufacturer of
Embroided Lace & Fabrics

PRIME LACE INDUSTRIES
(PVT.) LTD.

C-8, S.I.T.E, Hyderabad
Tel: 022-3880107 Fax: 022-3880381

محمد عدنان خان

پورب کے ہم زاد

رنگ و چمن، عروج و زوال، عشق و مستی اور فنا و بقا کے رنگوں سے معمور صدیوں پر محیط داستان جس کی مکانیت تبت کی فلک بوس چوٹیوں سے لے کر ٹیکسلا کی سرسبز وادیوں تک پھیلی ہوئی ہے۔

ردا کو ٹیکسلا میں صدیوں پرانے کشان دورِ حکومت کا شہزادہ ملا جو کچھ کہنا چاہتا تھا۔ شہزادے سے دور رکھنے کے لئے مکروہ صورت بوڑھا بجر ولال سامنے آیا اور ردا کی پریشانیوں کا آغاز ہوا۔ ایک بزرگ نے ردا کو بتایا کہ شہزادے کے ہم زاد کو آزاد کروانے کے لئے تمہارا انتخاب ہوا ہے۔ ردا ایک حادثے میں کوما میں چلی گئی۔ اسپتال میں اس کے اندر سے روشنی کا پرت نکلا اور ماضی میں سفر کرتے ہوئے ہزاروں سال پہلے کے تبت میں لے گیا جہاں جوبی پہاڑ پر بنی عبادت گاہ اس کا مسکن تھی۔ یہاں بزرگ خاتون رہتی تھیں جو شہزادے کے علاج کے لئے محل گئی ہوئی تھیں۔ شیطانی قوتوں کو ردا کی آمد کا علم ہوا تو مشکلات کھڑی کیں۔ محل سے واپس آکر بزرگ خاتون نے جوبی پہاڑ پر رہنے کی بجائے تبت کے اس علاقے کا رخ کیا جہاں ان کے استاد مقیم تھے۔ شہزادہ سلطنت چھوڑ کر ان کی تلاش میں نکلا۔ اس دوران میں بادشاہ کنذل کڈ فیزز کے بھائی راجا پدل نے لچھاوی کے ساتھ مل کر تخت پر قبضہ کر لیا اور شہزادے اور بزرگ خاتون کو مارنے کی ہر طرح سے کوشش کی مگر وہ محفوظ رہے۔ شہزادے اور بزرگ خاتون کی شادی ہوگئی۔ دشمن شہزادے اور اس کے خاندان تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے مگر بزرگ خاتون تک نہ پہنچ سکے۔ وہ کہاں گئیں، کسی کو پتہ نہیں چلا۔ اس کے ساتھ ہی ردا بھی اگلے سفر پر روانہ ہوئی۔

کشان سلطنت میں قیام کی مدت پوری ہوتے ہی میں وہاں سے روانہ کر دی گئی۔ اگلا پڑاؤ جس مقام پر تھا، وہ ماضی کی اِنکا تہذیب کا جیتا جاگتا شہر ماچو پیچو تھا۔ بلند و بالا پہاڑوں کی چوٹیوں پر بسائے جانے والے اس شہر تک عام لوگوں کی رسائی اُس دور میں مشکل تھی۔ اس کے قیام کا مقصد بیرونی حملہ آوروں کو شہر میں داخل ہونے سے روکنے کے ساتھ مخفی علوم کی ترویج تھا۔ یہ کشان سلطنت کے زوال کے چودہ سو سال بعد کا دور تھا۔ ماچو پیچو کا شہنشاہ جب تبت پہنچا تو اس کی

شہزادہ جے ونت سے دھرماراجیکا میں ملاقات ہوئی تھی اور شہزادے کی کہانی معلوم ہوئی۔ پاچاکوتی کو تعلیم ادھوری چھوڑ کر تبت جانا پڑا۔ راستے میں وہ شیاطین کا آلۂ کار بن گیا۔

میں جب شہر کے مرکزی دروازے پر پہنچی تو ہر طرف محافظ تھے۔ موقع تلاش کرتے ہی اندر داخل ہوئی تو گھنٹا بج گیا— میرا رخ سن نامی عبادت گاہ کی طرف تھا جس کے عقب میں امیر کبیر بوڑھے میاں بیوی کی رہائش گاہ تھی۔ وہاں سے عبادت گاہ میں ہونے والی سرگرمیوں کو کسی حد تک دیکھا اور سنا جا سکتا تھا۔

پاچاکوتی اپنے نائب کوپ ابیزا کے ہمراہ عبادت گاہ میں موجود تھا اور وہ جے ونت کا نام لے رہے تھے۔ گفتگو میں بار بار جے ونت کا نام آرہا تھا۔ قدیم زبانوں سے تھوڑی بہت شدبد تھی اس لئے ان کی گفتگو سمجھ میں آرہی تھی۔

معاملہ یہ تھا کہ پاچاکوتی نے تبت میں قیام کے دوران شہزادہ جے ونت کے ہم زاد پر کافی تحقیق کی تھی اور اس سلسلے میں دھرماراجیکا کے چکر بھی لگائے تھے۔ اسے علم ہو گیا تھا کہ سلطنتِ کشان کے مدفون خزانوں کا علم صرف شہزادے کے ہم زاد کو ہے۔ پاچاکوتی نے 1438ء میں جب بلند چوٹیوں پر ماچو پیچو کی بنیاد رکھی تو اسے کثیر سرمائے کی ضرورت تھی۔ اس نے کوپ ابیزا اور غلام جن قرقوق کی مدد سے شہزادے کے ہم زاد کو قابو کرنے کا منصوبہ بنایا۔ تینوں کی متفقہ رائے تھی کہ یہ مشکل کام نہیں۔

آدمی جب تک خول میں بند رہتا ہے، اس کی طرزِ فکر آزاد نہیں ہوتی۔ اس کے منصوبے اور سوچ میں نقص ہوتا ہے۔ انہوں نے جے ونت کے ہم زاد کی طاقت کا اندازہ لگانے میں غلطی کی۔ پاچاکوتی نے اسے قابو کرنے کے لئے ہر حربہ اور طریقہ اپنایا۔ اس کے غلام جن قرقوق نے جے ونت کا دھرماراجیکا میں جینا دوبھر کر دیا تھا۔ وہ بزرگ خاتون کے تصور میں رہنا چاہتا تھا مگر پاچاکوتی اس بات سے لاعلم اسے غلام بنانے کی کوشش میں تھا۔ نتیجے میں ایسی آگ بھڑکی جس نے ماچو پیچو کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔

ان کی گفتگو سے مجھے اندازہ ہوا کہ جے ونت کا ہم زاد بھی وہاں موجود تھا جسے قرقوق نے قابو کیا ہوا تھا۔ اسے مجبور کیا جارہا تھا کہ خزانے کی نشاندہی کرے مگر اس نے ایک لفظ نہیں کہا۔ پاچاکوتی شدید جھلاہٹ کا شکار تھا۔

میں آوازیں سننے کے ساتھ ساتھ دیکھنا چاہتی تھی کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔ خیال گزرا کہ وہ تینوں میری موجودگی کو کسی نہ کسی حد تک محسوس کر رہے تھے کہ کوئی ان کی باتیں سن رہا ہے مگر کون ہے، وہ یہ دیکھنے سے قاصر تھے۔ وہ اسے وہم سمجھ کر نظر انداز کر رہے تھے اس لئے ایک دوسرے سے اظہار نہیں کیا۔

پاچا کوتی نے آگ سلگائی ہوئی تھی اور وہ اس پر کچھ پڑھ کر پھونک رہا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر میں انگارے نکال کر جے ونت پر ڈال دیتا مگر جے ونت نے کسی طور خاموشی نہ توڑی۔ ایک طنزیہ مسکراہٹ اس کے چہرے کا احاطہ کئے ہوئے تھی جسے دیکھ کر ان لوگوں کی ناگواری میں اضافہ اور رویے میں شدت آ رہی تھی۔

یہ منظر مجھ سے نہیں دیکھا گیا۔

تھوڑی دیر گزری تھی کہ اندھیرا پھیلنے لگا اور زمین تھر تھرانے لگی جیسے زلزلہ آنے والا ہو۔ اس کے ساتھ ہی گھنٹے بجنا شروع ہو گئے جو بیرونی حملے کی اطلاع تھی۔ پاچا کوتی اور کوپ ابیزا تیزی سے باہر نکلے۔ وہ حواس باختہ تھے کہ ہوا کیا ہے۔ اتنے میں شور مچ گیا کہ دشمن کے جتھے ماچو پیچو کا ناقص حصار توڑتے ہوئے شہر میں داخل ہو گئے ہیں۔ اتنی بڑی تعداد میں ہم زاد دیکھ کر ہیبت طاری ہو گئی۔ جو اٹھا پٹخ ہوئی، وہ ناقابلِ بیان تھی۔ جو سامنے آیا، انہوں نے اٹھا کر سینکڑوں فٹ گہری کھائی میں پھینک دیا۔ پاچا کوتی اور کوپ ابیزا فرار ہو گئے۔

دوسری جانب قرقوق جو جے ونت کی نگرانی پر مامور تھا، ہم زاد اس پر مکھیوں کی مانند چمٹ گئے اور گھسیٹ کر اسی آگ میں جھونک دیا جس سے جے ونت کو جلایا جا رہا تھا۔ عجیب آگ تھی جس میں قرقوق ایسے جل رہا تھا جیسے سوکھی لکڑی آگ میں جلتی ہے۔ اس کی خوف ناک چیخوں سے دل دہل گیا۔ علاقے میں موجود لوگوں کے جسم پر چیچک جیسے دانے ابھر آئے۔ اس طرح کے دانے میں نے پاچا کوتی اور کوپ ابیزا کے جسم پر بھی دیکھے جب وہ فرار ہو رہے تھے۔ میں گواہ تھی کہ ماچو پیچو کی تباہی میں جے ونت کا کوئی کردار نہیں تھا۔ جو ہوا، پاچا کوتی کی حرص و ہوس کا نتیجہ تھا۔

ہلاک ہونے والا قرقوق عام جن نہیں تھا۔ اس کا سلسلۂ نسب امیر ابن جاقم کے خاندان سے ملتا تھا۔ "جاقم" جنات میں اثر و رسوخ والا

خاندان سمجھا جاتا تھا۔

ماچو پیچو کا معاملہ نہ کھلنے والے راز جیسا تھا۔ اس کی وجہ وہ حصار تھا جو پاچاکوتی اور کوپ ایبزا نے بڑی دشواری اور ریاضت کے بعد ماچو پیچو کے اطراف قائم کیا تھا۔ کتنی تباہی ہوئی، کسی کو علم نہیں تھا۔ ایسے میں ذمہ داری کا بوجھ جے ونت کے پلڑے میں آن گرا حالاں کہ وہ بے قصور تھا۔ آنے والے ہم زاد اس کے دوست اور ہمدرد تھے۔ جو کچھ ہوا، اس کے ذمہ دار پاچاکوتی اور کوپ ایبزا تھے۔

میں حیران تھی کہ یہاں رہنے والوں کے جسم پر پھوڑے پھنسیاں کیوں کر نمودار ہوئیں۔ شہر کی انتظامیہ کے غائب ہونے کے بعد پیچھے رہ جانے والے لوگ ماچو پیچو چھوڑ کر جانا چاہتے تھے مگر راستے مسدود تھے۔ زمین لرزنے سے بڑے بڑے پتھر رکاوٹ بن گئے تھے۔ عجیب افراتفری اور وحشت کا عالم تھا۔ وہ چیچک زدہ جسموں کے ساتھ خوف و ہراس کے عالم میں مدد کے لئے پکار رہے تھے۔

مجھے جِلد پر جلن کا احساس ہو رہا تھا حالاں کہ میں یہاں مادی جسم کے ساتھ موجود نہیں تھی۔ جب میں یہاں آئی تھی تو سب کی نظروں سے اوجھل تھی۔ ابتدائی سن عیسوی کے جس دور میں اور تبت و نیپال کے جن علاقوں سے چودہ سو سال کا سفر طے کر کے میں ماچو پیچو پہنچی تھی، اس کا مقصد واضح ہو گیا تھا۔

میں ماچو پیچو میں ہونے والی تباہی کی عینی شاہد تھی۔ شہنشاہ پاچاکوتی، کوپ ایبزا اور قرقوق اس علاقے میں استدراجی لہروں کا ایسا نظام بنانے میں کامیاب ہو گئے تھے جس سے اس جگہ پیش آنے والے واقعات کو دور بیٹھ کر دیکھنا ممکن نہ تھا۔

قرقوق کی ہلاکت کا مقدمہ جنات کی دنیا کی عدالت میں صدیوں سے زیر التوا تھا جس کا مرکزی فریق جے ونت کے ہم زاد کو بنایا گیا تھا۔ وہ لوگ اس معمّے کو سلجھانے سے قاصر تھے۔ گواہوں کی عدم دستیابی کے علاوہ جو حالات پیش آئے، اس پر بھی پردہ تھا۔ جے ونت چوں کہ ملزم نامزد تھا، ابن جاقم کے قبیلے نے اسے سزا دلوانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔

ایک جانب جے ونت ہم زادوں کی فوج کے ساتھ موجود تھا تو دوسری جانب وہ بوڑھا بجرو لال جو میری جان کے درپے تھا، میرے گھر کے سامنے آسن جمائے بیٹھا تھا۔ وہ خود کو کشان

سلطنت کے خزانوں کا وارث سمجھتا تھا۔

سارا معاملہ مجھ پر کھل چکا تھا۔ میں ماچو پیچو کی حدود سے نکلنے کے لئے تیزی سے خارجی گزر گاہ کی جانب دوڑ رہی تھی جو داخلی راستے کی مخالف سمت میں واقع تھی۔ دیگر افراد کا رخ بھی اسی جانب تھا۔ سب افراتفری کا شکار تھے۔ مجھ میں اور ان میں فرق یہ تھا کہ وہ موت کے خوف کی وجہ سے ہر قیمت پر ماچو پیچو سے نکلنا چاہتے تھے۔ میں اس خوف سے آزاد تھی۔ میں کسی کو دکھائی نہیں دے رہی تھی اور پھر میرا جسم چیچک جیسے مرض سے بھی محفوظ تھا۔

پہاڑی گزر گاہوں سے اترنا مشکل ہوتا ہے۔ بہت سنبھل کر قدم رکھنے پڑتے ہیں۔ لوگوں کے ہجوم سے بچتے ہوئے میں نے بالکل علیحدہ راستے کا انتخاب کیا۔

جے ونت کے ساتھی ہم زادوں کی آمد کے ساتھ آسمان سے دھوپ اور روشنی غائب ہو گئی تھی اور ہلکا اندھیرا چہار سو پھیل گیا تھا جسے سیاہ بادلوں نے اب مزید گہرا کر دیا تھا۔ شام کا وقت نزدیک تھا۔ ساتھ میں جنگل اتنا گھنا تھا کہ روشنی پہنچنا محال تھی۔ میں بمشکل تمام نیچے اتر رہی تھی۔ جنگل کے باسیوں پر چھایا سکوت اور بادلوں کی ہلکی ہلکی گڑگڑاہٹ کسی طوفان کا پیش خیمہ تھی۔

پہاڑ سے اترتے ہوئے میں ایسی جگہ کی تلاش میں تھی کہ طوفان کی صورت میں خود کو محفوظ رکھ سکوں۔ نیچے دریائے یوروبمبا روانی سے بہہ رہا تھا۔ اس تک پہنچنا اور اسے پار کرنا بظاہر ممکن نہ تھا۔ اگرچہ میں روشنی کے جسم کے ساتھ اس دور میں تھی لیکن وہاں بھیجنے والے مجھے کسی حد تک عام لوگوں کی طرح ان واقعات سے گزارنا چاہتے تھے۔ میں اس یقین کے ساتھ نیچے اتر رہی تھی کہ کوئی نہ کوئی راستہ نکل آئے گا جس سے اگلی منزل کا تعین ہو گا۔

اتنے میں لیموں کے برابر سفید گولیاں برسنا شروع ہوگئیں۔ گھبراہٹ میں اپنی رفتار تیز کی تو پیر پھسلا اور کئی قدم لڑھکتی چلی گئی یہاں تک کہ پہاڑ میں بنے ایک بڑے سوراخ کے منہ پر جا گری اور بنا سوچے سمجھے جھٹ سے گھٹنوں کے بل چل کر اندر داخل ہوگئی۔

باہر چھوٹے بڑے اولے قہر ڈھا رہے تھے۔ اندھیرا مزید گہرا ہو گیا تھا۔ ابھی زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ ماتھے پر ابروؤں کے درمیان تل کی شکل میں سنگِ سر جو سرپ ککولا نے تحفے میں

دیا تھا، گرم ہونے لگا۔ کلائی پر موجود منکے سے بھی حرارت اور ہلکی روشنی خارج ہو رہی تھی۔ چاروں جانب دیکھنے کی کوشش کی تو آس پاس حرکت کا احساس ہوا۔ لگتا تھا کہ میں اژدھے کی کھوہ میں داخل ہو گئی ہوں۔ منکے کی ہلکی روشنی میں دیکھنے پر اندازہ ہوا کہ اژدھا خود خوفزدہ ہو کر دیوار کے ساتھ چپک گیا تھا۔

اندر بیٹھنا اور باہر نکلنا دونوں محال تھا۔ طوفان سے بچنے کی کوشش میں اژدھے کے گھر بن بلائی مہمان بن گئی۔ وہ دبکا بیٹھا تھا۔ میں بھی سمٹ کر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر میں اولے بارش میں تبدیل ہو گئے مگر طوفان کی شدت برقرار تھی۔ حالات ایسے تھے کہ میرے ساتھ ماچو پیچو سے نکلنے والے لوگوں میں سے شاید ہی کوئی بچا ہو۔

دریائے بمبا کا پاٹ ماچو پیچو کے باسیوں اور بارش کے پانی سے بھر چکا تھا۔ پانی کی سطح اتنی بلند ہو گئی تھی کہ اژدھے کے بل سے چند فٹ کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ یہاں پر مزید ٹھہرنا زندگی داؤ پر لگانے کے مترادف تھا۔ شش و پنج کا شکار تھی کہ اژدھے نے بل کی طرف رینگنا شروع کر دیا۔ دریائے بمبا کا بپھرا ہوا پانی غار کے منہ تک پہنچ رہا تھا۔ غار کا دہانہ چوں کہ اوپر کو تھا اس لئے پانی اندر آنے کا فی الحال امکان نہیں تھا۔ میں دہانے سے دور اندر کی جانب بڑھنے لگی، اس یقین کے ساتھ کہ اژدھا نقصان نہیں پہنچائے گا۔ حملہ کرنا ہوتا تو پہلے کر چکا ہوتا۔

اندر گہرا اندھیرا تھا۔ منکے کی مدہم روشنی میں بمشکل آگے بڑھ رہی تھی کہ نہ جانے کہاں سے ہوا کا تیز اور فرحت بخش جھونکا آیا اور آگے بڑھنے کے لئے ہمت بندھائی۔

حیرت کی انتہا نہ رہی جب غار کے اندر قدیم طرز کے بھاری دروازے پر نظر پڑی جس کی چوکھٹ پر زنجیر لٹکی ہوئی تھی۔ زنجیر ہٹاتے ہی دروازہ خود بخود کھلتا چلا گیا۔

خوش بودار ہوا کے جھونکے سے وجود ایک مرتبہ پھر معطر ہو گیا اور روشنی پھیل گئی۔ اندر داخل ہوئی تو نہایت خوب صورت اور کشادہ کمرا میرے سامنے تھا۔ مڑ کر دروازے کو دیکھا، یہ بھاری بھرکم اور سرخ چندن (صندل) کی لکڑی سے بنا تھا۔ دروازے کو دیکھنے کا مقصد اس کی کوئی نشانی یاد رکھنا تھی تا کہ یہاں سے واپسی میں مشکل نہ ہو۔ (قسط: ۴۷)

Since 1990

MOTOLUX

INDUSTRIES

A GLOVES ENGINEERING COMPANY.

Motolux Street,Muzzafarpur, Ugoki Road,
Sialkot-51340,Pakistan,
Tel: +92-52-3252284,Fax: +92-52-3240216
info@motolux.pk

تجمل
Tajammal
TRAVELS (PVT) LTD.

IATA
ACCREDITED AGENT
IATA Code: 27342433

تجمل ٹریولز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

تجمل للسفریات (الخاصه) المحمدوده

ویزہ + ایئرلائن ٹکٹ

ہوٹل + زیارات ٹرانسپورٹ

بجٹ پیکج
اکانومی پیکج

5
ہوٹل کی بکنگ

ٹی ایچ اے اوورسیز ایمپلائمنٹ پروموٹرز

شبعة تی ایچ اے 〈THA〉 لتطور الامور تتعلق بالعمال/الموعطفین الاجانب

THA
OVERSEAS EMPLOYMENT PROMOTERS
Licence No. 4189/LHR
〈خصة تسعة:۴۱۸۹/ایل ایچ آر

- Labour Visa
- Skilled Visa
- Un Skilled Visa

thaoep1@gmail.com

متحدہ عرب امارات، سعودی عرب، قطر
ملائشیا، میں ملازمت کے شاندار مواقع

رانا تجمل حسین
CEO

+92 300 6654 211
+92 302 1165 300
+92 321 6680 266
+92 41 2641 904

Office No. 54, Gate No. 5, Iqbal Stadium. Faisalabad. PK

محمود فاروقی

ٹھنڈا سر ــــ گرم پیر

"مسئلہ یہ نہیں کہ اختلاف کس بات پر ہے۔ اختلاف کو کس طرح پیش کیا جاتا ہے، یہ چیز بات کو بناتی اور بگاڑتی ہے۔"

بات کرنا ایک فن ہے لیکن اکثر لوگ اس فن سے واقف نہیں۔ کسی دانشور کا کہنا ہے،

"آدمی کے بس کی بات نہیں کہ وہ گفتگو میں بذلہ سنجی سے سحر پیدا کرسکے۔ دراصل بات سننے والا ہماری بات میں حسن پیدا کرتا ہے۔"

اس قول میں لطیف نکتے کی جانب اشارہ ہے، جاننے کے لئے آگے پڑھئے۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم دوسرے کی بات سننے پر توجہ نہیں دیتے بلکہ اس تیاری میں لگے رہتے ہیں کہ مقابل خاموش ہو اور ہم بول پڑیں۔ اگر ہم اس کی بات توجہ اور دلچسپی سے سنیں اور اس تاثر سے گریز کریں کہ ہم موقع کی تلاش میں ہیں کہ وہ سانس لینے کے لئے رکے اور ہم اپنی بات کردیں تو وہ توجہ اور دلچسپی سے ہماری بات سنے گا۔ اس طرح جہاں بات میں حسن پیدا ہوگا، وہاں ہماری بات کی اہمیت بڑھ جائے گی۔

بات چیت میں باہمی اعتماد اور مقابل کا خیال رکھنا اہم ہے۔ ہر شخص چاہتا ہے کہ اسے سنا اور سمجھا جائے اور اہمیت دی جائے۔ اہمیت کے لئے تعریفوں کے پل باندھنے کی ضرورت نہیں بلکہ اس کی بات غور سے سننا اور جس وقت وہ بول رہا ہے، اسے وقت دینا اہم ہے۔

اکثر لوگوں کی کوشش ہوتی ہے کہ جب تک ہم بول رہے ہیں، سب ہماری بات پر دھیان دیں اور خود نہ بولیں۔ ایسے میں چاہئے کہ بات کو طول نہ دیں اور غیر ضروری وضاحت سے پرہیز کریں۔ کوئی ضروری نہیں کہ آپ کہیں،

"کوئی دس بجے ہوں گے یا شاید گیارہ کا وقت تھا، کون سا دن تھا، یاد نہیں رہا۔ ہاں! یاد آیا

جمعہ تھا! نہیں نہیں، ہفتہ تھا۔ اس دن میں ایک دوست کے گھر سے آرہا تھا جو ریلوے میں ملازم ہے۔ آپ غالباً اس کو نہیں جانتے، وہ چوک کے بائیں طرف جہاں پرانی چھتریاں مرمت کرنے والا بیٹھتا ہے، بس آگے چل کر کونے کا مکان اسی کا ہے۔"

بات چیت کا یہ انداز کسی معقول آدمی کو گوارا نہیں۔ اس طرح کی وضاحت ہمیشہ اکتا دینے والی ہوتی ہے۔ جس جملے کو سننے کا وہ منتظر ہے، وہ کہنے سے پہلے دس غیر ضروری جملے کہہ دینا، سننے والی کی توجہ بدل سکتا ہے۔ بات جب بھی شیطان کی آنت بنے گی، اپنا اثر کھو دے گی۔

اس میں شک نہیں کہ دوسرے کی بات سننے کی عادت پیدا کی جائے مگر مقابل کی بات سنتے وقت تائید یا ہنکار کے لئے مناسب الفاظ اور موزوں جملوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

بہت خوب!

پھر کیا ہوا؟

ایسا ہی ہے!

ایسے ربر اسٹامپ جملے مقابل کی روانی میں رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ جب ہم بات کرتے ہیں تو اس وقت چند مخصوص الفاظ یا جملوں کو تکیہ کلام بنالیتے ہیں۔ یہ بات بھی اکتاہٹ کا باعث بنتی ہے۔ مثال کے طور پر ہر تھوڑی دیر بعد یہ کہنا کہ "میں کیا کہہ رہا تھا" یا ہر بات کے خاتمے پر سننے والے کو شک کی نظر سے دیکھتے ہوئے یہ کہنا "نہیں سمجھے آپ؟"

سامع کی سمجھ پر شک کرنا اس کے لئے توہین آمیز ہو سکتا ہے اور اس بنیاد پر وہ ہماری کہی گئی اچھی سے اچھی بات کو اہمیت نہیں دے گا یہ سوچ کر کہ کہنے والا خود کو برتر سمجھتا ہے اور اپنی رائے ہم پر مسلط کرنا چاہتا ہے جب کہ دوسروں کو اخلاقیات کا درس دیتا ہے۔

کچھ لوگ گفتگو میں اپنے آپ کو زیادہ بیان کرتے ہیں۔ یہ بات دانا شخص تو کیا، عام آدمی کے لئے بھی ٹھیک نہیں کیوں کہ ایسا کرنے سے شخصیت میں وزن نہیں رہتا۔ اپنی لکھی ہوئی کہانی یا شعر کا حوالہ دینا ایک عام بات کو خود ستائی کی حد میں لاتا ہے۔ ہم کیا اور کون ہیں، یہ گفتگو میں نظر آجاتا ہے۔

بذلہ سنجی گفتگو کا حسن ہے۔ برطانوی مصنف جارج برنارڈ شا کی بذلہ سنجی مشہور ہے۔

ایک صحافی نے جارج برنارڈ شا سے پوچھا کہ آپ کی طویل عمر کا راز کیا ہے؟

برنارڈ شا نے جواب دیا، میں اپنا سر ٹھنڈا اور پیر گرم رکھتا ہوں۔

کہتے ہیں کہ جب انٹرویو شائع ہوا تو اس کو پڑھ کر کچھ لوگوں نے سر پر برف رکھنی شروع کی اور پیروں کو گرم رکھنے کے لئے سینکنے لگے۔ نتیجے میں کسی کو زکام ہوا اور کسی کو بخار۔ جب عوام پر اس کے اثرات کی خبر ذرائع ابلاغ کا حصہ بنی تو جارج برنارڈ شا کے بیان پر سوالات اٹھے۔

انہوں نے وضاحت کی۔

"میرا وہ مطلب نہ تھا جو تم سمجھ رہے ہو۔ سر ٹھنڈا رکھنے سے مراد یہ ہے کہ میں غصہ نہیں کرتا اور پیر گرم رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ میں ہمیشہ پیدل چلنے کو ترجیح دیتا ہوں۔ یہ طویل عمر کا راز ہے۔"

سمجھدار شخص چاہے اس کا تعلق جس شعبے سے ہو جیسے وکالت، صحافت یا نفسیات، وہ معقول اور واضح سوال سے مقابل کو بلا جھجک جواب دینے کی راہ پیدا کرتا ہے۔ عموماً تعارف کے فوراً بعد یا پہلی ملاقات میں بات آگے بڑھانا مشکل ہوتا ہے لیکن یہ ملاقات کرنے والے پر منحصر ہے کہ وہ مقابل کو کس طرح بلا جھجک خیالات کے اظہار کا موقع دیتا ہے۔

مبہم اور بے معنی جملے گفتگو بڑھانے کے لئے راہ پیدا نہیں کرتے۔ بات چیت اجنبی سے ہو، محفل میں ہو یا کاروبار سے متعلق، سوال فرد کی دلچسپی سے متعلق ہونا چاہئے۔ بیچ بیچ میں وہ سوال کیجئے جس میں آپ کی دلچسپی ہے۔ اس طرح گفتگو کے اختتام پر جب دونوں اٹھیں گے تو کسی کو یہ محسوس نہیں ہوگا کہ ہمارا وقت ضائع ہوا۔

گفتگو میں اختلاف کا موقع بھی آتا ہے لیکن ایک لکھے پڑھے انسان کا کہنا ہے،

"مسئلہ یہ نہیں کہ اختلاف کس بات پر ہے بلکہ اختلاف کو کس طرح پیش کیا جاتا ہے، یہ چیز بات کو بناتی اور بگاڑتی ہے۔"

چناں چہ جب گفتگو ایسے موڑ پر آجائے کہ جہاں اختلاف کا اظہار ضروری ہو تو اپنا موقف اس طرح پیش کیا جاسکتا ہے،

"اس بات سے میں متفق ہوں لیکن اگر آپ برا محسوس نہ کریں تو اس کے دوسرے پہلو کے سلسلے میں یہ عرض کردوں۔۔۔"

دوستانہ دلیل گفتگو کو قابلِ قبول بناتی ہے اور اپنی رائے پر نظرِ ثانی کے لئے آمادہ کرتی ہے لیکن اختلافی بات سنتے ہی یہ کہہ دینا کہ

"آپ کی بات غلط ہے۔ میں اتفاق نہیں کرتا۔ عقل کا استعمال کر کے بات کرنی چاہئے، آپ معاملے کی نوعیت نہیں سمجھے وغیرہ۔۔۔"

ہم کتنے درست اور پُریقین کیوں نہ ہوں، فیصلہ کن انداز میں کسی کی بات کی تردید نہ کریں بلکہ گفتگو کے فن کے تحت مقابل کی بات کو نبھاتے اور اس کی بات کے وزن کو برقرار رکھتے ہوئے اس کو صحیح پہلو سے آگاہ کیا جائے۔

گفتگو میں سحر اس وقت بڑھ جاتا ہے جب ہم اپنا موقف پیش کرنے کے ساتھ ساتھ مقابل کے موقف کو بھی کھلے دل سے سراہتے ہیں۔ ہر فرد اپنی گفتگو میں چند درست جملے اور دل کو چھونے والی بات کہہ دیتا ہے۔ اگر ہم نے اپنے مقابل کی گفتگو غور سے سنی ہے تو چاہئے کہ جب ہمارے بولنے کی باری آئے تو اس کے کہے گئے جملوں کو دہرائیں جیسے کہ

"آپ کا کہنا درست ہے کہ اس واقعے میں فلاں بندے کا قصور نہیں، اس کا ذہن پراگندہ تھا اس لئے معمولی بات پر غصہ آ گیا۔"

سامع کو احساس ہوگا کہ ہم نے یکسو ہو کر اس کی بات سنی ہے، اس کو فوقیت دی ہے، اب وہ ہماری بات غور سے سنے گا۔

ایک موضوع پر بات کرتے کرتے فوراً کسی اور موضوع کو اپنانے سے بھی سننے والے پر اچھا اثر نہیں ہوتا۔ جب تک حاضرینِ محفل پہلے موضوع میں دلچسپی لے رہے ہیں، موضوع تبدیل نہ کریں۔ ایسے میں سننے والوں کو بھی بولنے کا موقع دیں۔

اس موضوع پر لکھنے کے لئے اندر میں ذخیرہ بہت ہے لیکن اختصار پیشِ نظر ہے۔ یہ بتانا ضروری ہے کہ بولتے وقت چہرہ اس طرف ہونا چاہئے جہاں سننے والا موجود ہے یا جس سے ہم مخاطب ہیں۔ بات چیت کے دوران چہرے کو ہاتھ یا کسی شے سے نہ چھپائیں۔ بولتے وقت آواز صاف ہو اور سننے والے کو ہمارے اندازِ گفتگو پر گنگناہٹ یا بڑبڑانے کا احتمال نہ ہو۔

بات چیت کا بنیادی فن یہ ہے کہ کہنے والا، اچھا سننے والا بھی ہو۔ یہ وہ نکتہ ہے جو ہماری عام بات کو بھی لوگوں کی نظر میں خاص بنا دیتا ہے۔

گلستان احمد

دنیا عالمِ اسباب ہے

اسباب سے دنیا قائم ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ 'بے شک اللہ جسے چاہتا ہے، بے حساب رزق عطا فرماتا ہے۔' زندگی مسلسل حرکت ہے اور حرکت نہ ہو تو زندگی موت کا لبادہ اوڑھ لیتی ہے۔ خاتم النبیین حضرت محمدؐ کا ارشادِ گرامی ہے کہ 'دس دنیا، ستّر آخرت۔' اس کی تفہیم اور حصول کے لئے حرکت اور چلت پھرت ضروری ہے۔

ٹرک کے پیچھے لکھا تھا،

"سکھ نال نصیباں دے۔"

سوچ میں پڑ گیا کہ اس کا کیا مطلب ہے۔

گاڑی میں ساتھ بیٹھے ہوئے دوست کو متوجہ کیا، دیکھو! کیا لکھا ہے۔

دوست نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا، ہاں جی! سکھ نصیب سے ملتا ہے۔

انداز اور الفاظ سے ظاہر تھا کہ وہ سمجھتا ہے کہ سکھ اور پُرسکون زندگی ہر کسی کو میسر نہیں۔

فہم کہتی ہے کہ سکھ اور نصیب میں تعلق ہے۔ اللہ نے دینِ فطرت پر پیدا کر کے سب کے نصیب میں سکھ لکھا ہے پھر ہم خوف و غم میں مبتلا کیوں ہیں اور اچھے نصیب کے حصول کا فارمولا کیا ہے—؟ دماغ کی تختی پر ابدالِ حق حضور قلندر بابا اولیاءؒ کا قول روشن ہوا،

با ادب — بانصیب
بے ادب — بے نصیب

باادب شخص بانصیب ہوتا ہے جب کہ بے ادب شخص کا ذہن نافرمانی کی وجہ سے ابتر ہے۔ اسے آسائشیں میسر ہیں — سکون نہیں۔ سکون اس ہستی کی فرماں برداری میں ہے جس نے اپنی معرفت کے لئے ہمیں پیدا کیا ہے۔

ٹرک پر تحریر جملہ درست مگر ادھورا ہے۔ سکھ کا تعلق نصیب سے ہے لیکن اگر نصیب کا

فارمولا لکھا جاتا تو بات مکمل ہوتی۔

لفظ نصیب کا مادہ ''نصب'' ہے۔ نصب کے معانی راسخ ہونا اور قائم رہنا ہیں، اس کے بغیر نگاہ کھلتی ہے نہ فہم حاصل ہوتی ہے۔

''جو لوگ علم میں راسخ ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ہمارا اس پر ایمان ہے کہ ہر شے اللہ کی طرف سے ہے۔'' (اٰلِ عمرٰن : ۷)

ہر شے من جانب اللہ ہے — مومن اس یقین پر خود کو اس ہستی کے سپرد کر دیتا ہے جس نے پیدا کیا ہے، بے حساب رزق عطا کیا ہے اور جس کی رحمت اور محبت کا شمار نہیں۔

''سکھ نال نصیباں دے'' لکھوانے والا شخص اور اس جملے کو پڑھ کر اس کی تائید کرنے والے خواتین و حضرات دکھ کا اظہار کر رہے ہیں کہ ان کی زندگی محرومی میں گزری ہے۔ انہوں نے قدرت سے شکوہ تو کیا مگر اپنی کوتاہی نہیں دیکھی اور دیکھیں بھی کیسے کہ جس ماحول میں وہ رہتے ہیں، وہاں کھانے پینے کے لئے کام کرنے اور کام کرنے کے بعد سونے کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ وہ ایسی زندگی گزار رہے ہیں جو ان کے لئے تخلیق نہیں کی گئی۔

ہر برقی آلے اور مشین کے ساتھ گائیڈ بک ملتی ہے جس کو بار بار پڑھ کر مشین کے پرزوں اور افعال سے واقفیت ہوتی ہے۔ زندگی بھی مشین ہے۔ دل اور دماغ اس کے دو بڑے اور بنیادی پرزے ہیں جن کے درست استعمال کے لئے guide book سے استفادہ ضروری ہے جو زندگی پیدا کرنے والی ہستی خالقِ کائنات اللہ تعالیٰ نے غیب سے ظاہر کی ہے۔ الہامی کتب guide books ہیں جو زندگی کے tools کا صحیح استعمال سکھاتی ہیں۔ ہم الہامی پیغام کو نہیں پڑھتے اور پڑھتے ہیں تو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ پھر کیسے مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہم نے عربی پڑھ کر ذمہ داری پوری کر لی؟

جس طرح مشین ایجاد کرنے والا ڈبّے کے اندر کتابچہ رکھ دیتا ہے کہ مشین کو کس طرح استعمال کرنا ہے، اسی طرح زندگی کیسے گزارنی ہے، یہ وہی بتا سکتا ہے جس نے زندگی کو پیدا کیا ہے اور اس کے اظہار کے لئے طرح طرح کے اجسام بنائے ہیں۔ زندگی کی گائیڈ بک پڑھے بغیر زندگی بسر کرنے والے کا حال کیا ہوگا؟

اللہ نے ہر امت کے لئے ایک رسول بھیجا۔ کتاب اور صحیفے وحی کئے۔ آخری آسمانی کتاب

قرآن کریم میں اللہ نے فرمایا ہے کہ جو کچھ اس کتاب میں ہے، یہ وہی ہے جو اس سے پہلے کی امتوں کو عطا کیا گیا۔ قرآن کریم اقوامِ عالم کے لئے ضابطۂ حیات ہے جس میں چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی بات وضاحت سے بیان کی گئی ہے۔ اس میں عروج کے اصول اور زوال کے اسباب بھی ہیں۔ اللہ نے فرمایا ہے،

"ہر شخص کے آگے اور پیچھے اس کے مقرر کئے ہوئے نگران لگے ہوئے ہیں جو اللہ کے حکم سے اس کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کسی قوم کے حال کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اوصاف کو نہیں بدل دیتی اور جب اللہ کسی قوم کی شامت لانے کا فیصلہ کرلے تو پھر وہ کسی کے ٹالے نہیں ٹل سکتی۔ نہ اللہ کے مقابلے میں ایسی قوم کا کوئی حامی و مددگار ہوسکتا ہے۔" (الرعد : ۱۱)

ہر شخص کے ساتھ فرشتے مقرر ہیں جو اللہ کے حکم سے اس کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ یہ آیت پڑھ کر کوئی شکوہ نہیں کرسکتا کہ اس کے نصیب میں سکھ نہیں۔ اللہ نے اس کے سکھ کے انتظام کے لئے فرشتے مقرر کئے ہیں۔ محرومی کی شکایت اس لئے ہے کہ آدمی الہامی علوم کی روشنی میں زندگی نہیں گزارتا۔ وہ رحمانی علوم سے دور، یقین سے لاعلم اور شک سے قریب ہے۔ جب تک وہ اپنے اوصاف نہیں بدلتا، اس کی حالت تبدیل نہیں ہوگی۔

لوگ کہتے ہیں کہ زندگی کا مقصد پیسہ ہو تو آدمی خوش نہیں رہتا۔ درست ہے لیکن اس میں قصور پیسے کا نہیں، سوچنے سمجھنے کی طرز اور نیت کا ہے۔ پیسہ کمانا اچھی بات ہے، آسائش کی خواہش فطری ہے اور مٹی کے جسم کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔ پیسے سے چھوٹے بڑے پیمانے پر فلاحی ادارے بنتے اور چلتے ہیں، آسائش کی خواہش سے تحقیق و تلاش، ایجادات اور ترقی کی راہیں کھلتی ہیں اور صحت مند زندگی کے لئے مٹی کے جسم کا صحت مند ہونا ضروری ہے۔ اگر کسی کی زندگی ناکامی کی تصویر ہے تو دراصل اس نے جسم کے ساتھ روح کے تقاضوں کو نہیں سمجھا، نہ جاننے کی کوشش کی کہ جسم کیا ہے۔

یہ تاثر بھی پایا جاتا ہے کہ غربت سے امارت تک سفر کے درمیان طویل فصیل ہے۔ جواب یہ ہے کہ لوگ ایسے بھی ہیں جنہوں نے مشقت کے ابتدائی سالوں میں ٹرک چلایا، سڑکوں کی صفائی کی، برتن دھوئے، باربرداری کا کام کیا،

چھوٹی دکان کھولی اور آج کروڑپتی ہیں۔ ان کو دولت ماں باپ سے ورثے میں نہیں ملی، اس مقام کے پیچھے تیس چالیس سال کی محنت ہے جس میں ذہن اس خیال پر قائم رہا کہ محنت کرکے طرزِ زندگی تبدیل کرنی ہے۔

دوسری جانب آدمی نے جس کام سے معاش کی ابتدا کی، عمر کے آخری ایام تک وہ اسی جگہ پر ہو تو ظاہر ہے کہ اس کا ذہن چھوٹی دکان سے باہر نہیں گیا یا اس نے ہمیشہ خود کو ٹرک ڈرائیور دیکھا حالاں کہ قدرت نے اسے ٹرک خریدنے کا خیال انسپائر کیا لیکن اس نے دن رات سستی، کاہلی کی وجہ سے اہمیت نہیں دی۔

انسانی شعور کی یہ خاصیت ہے کہ ہدف متعین کئے بغیر آگے نہیں بڑھتا۔ اگر اس کا مقصد بے کار رہنا ہے تو وہ سستی اور کاہلی کو مرکزیت بناتا ہے۔ بچے کا ہدف پہلی کلاس کا امتحان ہے جسے پاس کرنے پر وہ خوش ہوتا ہے اور توجہ دوسری کلاس میں کامیابی پر مرکوز کرلیتا ہے اور درجہ بہ درجہ شعور کی منزلیں طے کرتا ہے۔ تعلیم کے بعد تجارت یا ملازمت کرتا ہے پھر شادی ہوتی ہے، بچے ہوتے ہیں، اب اس کا منشا اپنے بچوں کی تعلیم ہے۔ بچے پڑھ لکھ جاتے ہیں، شادی کرتے ہیں اور وہ نانا دادا بن جاتا ہے۔ بڑھاپا جسمانی انحطاط کا دور ہے، اس کے آغاز پر اکثر لوگ زندگی سے غیر مطمئن نظر آتے ہیں۔ ان میں وہ افراد بھی شامل ہیں جو مالی اعتبار سے خوش حال لیکن باطن میں بدحال ہیں۔

بڑھاپا اس دنیا کا آخری اسٹاپ ہے جس پر اترنے والا شخص جس گاڑی میں بیٹھتا ہے، وہ واپس اس دنیا میں نہیں آتی۔ اب آدمی کو فکر ہوتی ہے کہ میں نے کیا کیا۔ جس دنیا کے لئے تگ و دو کی، اس کا اسٹیشن پیچھے رہ گیا ہے، گاڑی اگلے اسٹیشن کی طرف بڑھ رہی ہے۔ پریشانی کی وجہ یہ ہے کہ اس نے شعور کو مادی توانائی سے سیراب کیا ہے جب کہ مادیت ٹوٹ پھوٹ کا نام ہے۔ چلتی ہوئی گاڑی بالآخر دنیا کے آخری اسٹیشن پر رک جاتی ہے اور وہ خود کو بند گلی میں محسوس کرتا ہے۔ جس کے پاس آسائش ہے، وہ بھی خوف میں مبتلا ہے اور جو تنگ دست ہے، وہ بھی نصیب سے شکوہ کناں۔

نوعِ آدم کا سب سے بڑا مسئلہ اپنے مقام اور نصب العین سے لاعلمی ہے۔ حدیثِ قدسی ہے،

"میں چھپا ہوا خزانہ تھا، میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں، پس میں نے محبت سے مخلوق کو تخلیق کیا۔"

حقیقی مقصد سے لاعلم فرد نے اپنے منصب کا ادب نہیں کیا۔ منصب کوئی لکڑی یا لوہے کا بنا ہوا تخت یا کرسی نہیں بلکہ علم ہے جس کی بنا پر وہ فی الارضِ خلیفہ ہے۔ زندگی سے غیر مطمئن شخص کو غور کرنا چاہئے کہ وہ دنیا میں کیوں آیا ہے؟ کیا کھانا پینا، سونا جاگنا، شادی، بچے اور دولت زندگی کا مقصد ہے یا اس دائرے سے اوپر بھی کوئی دائرہ ہے؟ اس نے وسائل سے استفادہ نہیں کیا جو اللہ نے اس کے لئے تخلیق کئے ہیں۔ دنیا عالمِ وسائل ہے لیکن ذہن چوری کی وجہ سے عالمِ مسائل بن جاتی ہے۔

کتاب "لوح و قلم" میں تحریر ہے،

"آج کی نسلیں گزشتہ نسلوں سے کہیں زیادہ مایوس ہیں اور آئندہ نسلیں اور بھی زیادہ مایوس ہونے پر مجبور ہوں گی۔ نتیجہ میں نوعِ انسانی کو کسی نہ کسی وقت نقطۂ توحید کی طرف لوٹنا پڑے گا۔ موجودہ دور کے مفکر کو چاہئے کہ وہ وحی کی طرز فکر کو سمجھے اور نوعِ انسانی کی غلط رہنمائی سے دست کش ہو جائے۔"

(کتاب: لوح و قلم)

آسان حل

بیٹے نے باپ سے کہا، افسوس ہوتا ہے کہ کوئی فرد اپنی اصلاح پر آمادہ نہیں۔ کیا یہ اتنا مشکل ہے؟ اصلاح کا آسان طریقہ کیا ہے؟ باپ نے کہا، کسی میں عیب دیکھو تو اسے اپنے اندر تلاش کرو۔ تمہارے اندر بھی وہی عیب ہے تو نکال دو۔ یہ اصلاح کا سب سے آسان طریقہ ہے۔

ہم ایسے ماحول میں رہتے ہیں جو مادی تقاضوں کا اسیر ہے اور جسم کی بھوک، پیاس اور آرام کو زندگی سمجھتا ہے۔ یہ جسم کا ادب مگر روح کی بے ادبی ہے۔ جسم اس دنیا میں رہ جاتا ہے، روح اگلے جہاں میں جاتی ہے جہاں اس کی رہائش کا تعین اس دنیا میں اعمال پر ہے۔

حاصلِ تحریر: اللہ نے ہر شخص کو دینِ فطرت پر پیدا کیا ہے — فطرت کے خواص اور اس کا علم عطا کیا ہے یعنی اس کے نصیب میں سکھ لکھا ہے۔ نظامِ فطرت میں ناشکرے شخص کے علاوہ ہر مخلوق پُرسکون ہے۔ فطرت پر قائم کوئی تخلیق اللہ کے حکم سے روگردانی نہیں کرتی۔ فطرت صدا دیتی ہے کہ سکھ سے واقف ہونے کا راستہ صرف اور صرف اللہ کی فرماں برداری ہے۔

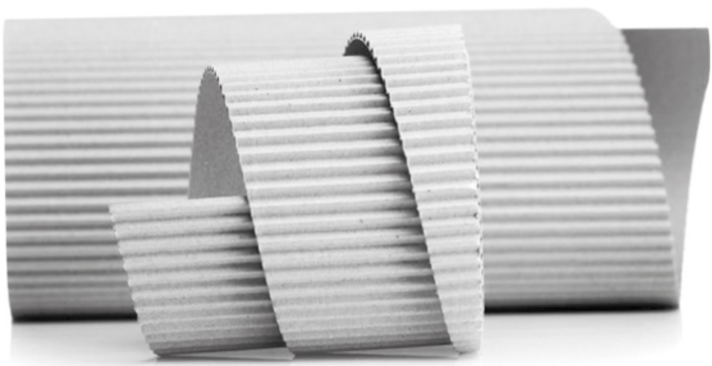

Manufacturer of
Liner & Floating Paper

PRIME PACK INDUSTRIES

C-21, S.I.T.E, Hyderabad
Tel: 022-3880627
Fax: 022-3880381

خواب تعبیر اور مشورہ

لاحول

زین العابدین، گیلان آباد: دو الّو مجھے دیکھ رہے ہیں، ایک سرخ اور دوسرا سفید ہے۔ وہ کچھ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی کئی پرندے ہیں۔ والدہ اور بہن میرے ساتھ ہیں۔بہن نے کہا، یہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ میں نے ورد کیا اور آنکھ کھل گئی۔

تعبیر:خواب میں الجھے ہوئے ذہن کی نشاندہی ہے۔ ذہن میں الوژن خیالات آتے ہیں جن کا کوئی سر پیر نہیں ہوتا۔ دوسری بات یہ ظاہر ہوتی ہے کہ آپ نے پرندے الّو کو دیکھا اور الّو کی نسبت سے لوگوں کے خیالات سنے ہیں۔ ایک پہلو یہ ہے کہ نیند بہت زیادہ نظر آتی ہے۔ سستی اور کاہلی کا بھی امکان ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہر طرح محفوظ رکھے۔ جب خواب یاد آئے تولاحول پڑھ لیا کریں۔

خون ٹیسٹ کرائیں

م۔ س، کراچی: سیدھا ٹخنہ پلپلا ہو رہا ہے۔ درد سے بے چین ہوں۔ڈاکٹر سے دوا لائی تو پہلی دفعہ لگاتے ہی سارا مواد نکل گیا جس کے بعد اس جگہ ایک سوراخ نظر آیا۔ سوراخ کی صفائی کرکے بیٹھی تو ابو نے دیکھا کہ میرے زخم کے قریب ایک کیڑا ہے۔ زخم کو قریب سے دیکھا تو اندر کئی کیڑے نظر آئے۔ ابو نے کان صاف کرنے کی تیلی لے کر ٹخنے کے زخم کی صفائی کی مگر اس میں کیڑے اتنے زیادہ ہیں کہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہے۔ان کیڑوں کے ڈر سے میں بہت رو رہی ہوں۔

تعبیر: جس جگہ صفائی نہیں ہوتی، وہاں ایسے کیڑے پیدا ہو جاتے ہیں جو جسم کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ آپ کو چاہئے کہ اپنے خون کا معائنہ کرائیں اور ڈاکٹر سے رجوع کریں۔

زیورات

خ۔ ع، لاہور: پیروں میں زنجیریں باندھ کر مجھے ایک بزرگ کے پاس لے جایا گیا۔ بزرگ نے فرمایا، اسے کھول دو، اس کی شادی میں خود

کرواؤں گا۔ پھر دیکھا کہ پیر اتنا وزنی ہے کہ میں چلنے کی کوشش کرتی ہوں مگر چلا نہیں جاتا۔ روڈ کے قریب بیٹھ گئی۔ پیر زیورات سے لدے ہیں جن کی وجہ سے پیر نظر نہیں آرہے ہیں اور وزنی بھی ہوگئے ہیں۔ ایک نورانی بزرگ تشریف لاتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اپنے پیر مجھے دے دو۔ میں پیر کاٹ کر ان کو دے دیتی ہوں۔

تعبیر: ذہنی یکسوئی کے بغیر کوئی بھی کام کیا جائے تو عام طرز سے نتیجہ اچھا مرتب نہیں ہوتا یا نتیجہ ہوتا ہی نہیں۔ ہوائی خیالات ہوتے ہیں، ہوا میں اڑ جاتے ہیں جب کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر بندے کی روح کو اللہ کی صفات کا علم ہوتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ علم کو پڑھنے کی دو طرزیں ہیں — مثبت ہے یا منفیت۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اچھا ارادہ کرتا ہے اور برے خیالات کی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ الحمد للہ، آپ کو اللہ نے روحانی صفات عطا کی ہیں۔ وسوسے سے نکلنے کا ایک طریقہ ہے کہ جب بھی منفی خیالات ذہن میں گشت کریں، لاحول پڑھ کر تین دفعہ الٹی طرف منہ کر کے تھتکار دیں۔

ساٹھ ہزار

ہاجرہ نسرین، ساہیوال: دو دفعہ یہ خواب آچکا ہے کہ نہر کے کنارے بستر پر والدہ کے ساتھ لیٹی ہوں۔ خواتین و مرد واٹر پروف چادریں اوڑھے پانی کے ساتھ تیرتے ہوئے آرہے ہیں البتہ کوئی پانی میں سیدھا اور کوئی الٹے منہ لیٹا ہے۔ ایک دو لوگ والدہ کے بہت قریب سے گزرے جس پر مجھے غصہ آیا۔ کچھ نہر سے باہر آکر گھروں کی طرف اور کچھ پانی میں آگے کی طرف بہہ رہے ہیں۔

تعبیر: خواب دو طرح کے ہوتے ہیں۔

۱۔ رویائے صادقہ ۲۔ رویائے کاذبہ

قانون یہ ہے کہ خواب بھی بیداری کی طرح زندگی ہے۔ بیداری اور خواب میں فرق یہ ہے کہ آدمی جب سوتا ہے تو ذہن کی پرواز تقریباً 60 ہزار گنا زیادہ ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سامنے جو کچھ نظر آتا ہے، وہ ذہن کی اسکرین پر واضح نہیں ہوتا نہ اس کا کوئی سر پیر ہوتا ہے۔ اس قسم کے خواب رویائے کاذبہ کہلاتے ہیں۔ اگر آدمی 60 ہزار گنا تیز رفتار ریل گاڑی میں سفر کرتا ہے تو درخت آپس میں ملے ہوئے نظر آتے ہیں، ان درختوں کو شمار نہیں کیا جا سکتا اس لئے کہ ذہن کی رفتار ریل گاڑی کی رفتار کے مطابق نہیں ہے۔ اسی طرح خواب میں رفتار

زیادہ ہو جاتی ہے جس سے آدمی کے لئے نقوش غیر واضح ہوتے ہیں۔ خواب ایک مکمل علم ہے۔ رویائے صادقہ میں وہ خواب شامل ہیں جن میں ماضی یا مستقبل کے بارے میں پیشین گوئی یا ریکارڈ وغیرہ کا اظہار ہوتا ہے۔

آپ کا خواب ظاہر کرتا ہے کہ شکوک و شبہات آپ کی زندگی میں زیادہ ہیں۔ دوسری طرف حالات مزید اچھے ہونے کی خوش خبری ہے— واللہ اعلم۔

طرزِ فکر

ی۔م، کراچی: علاج کروانے گئی تو صاحبِ حکمت معالج نے چائے لانے کا کہہ کر پیسے دیئے جو میں نے نہیں لئے اور اپنے گھر کی طرف دوڑ لگادی۔ راستے میں احساس ہوا کہ میرا لباس نامناسب ہے۔ تھوڑا آگے گئی تو ایک لڑکی میری طرح کے لباس میں ورزش کررہی تھی۔ میں اسے دیکھ کر مطمئن ہوگئی۔ چائے کے لئے گھر میں داخل ہوئی۔ احساس ہوتا ہے کہ وقت تیزی سے گزر رہا ہے، کہیں دیر نہ ہو جائے۔

تعبیر: الحمدللہ! آپ کا ذہن کھلا ہوا ہے لیکن ذہن کی مثبت طرزِ فکر میں منفی طرزِ فکر کا غلبہ ہے۔ بزرگ تشریف لائے، الحمدللہ— زیارت ہوئی۔ خواب کا تجزیہ کیا جائے تو اس میں جو چیزیں معانی رکھتی ہیں، وہ یہ ہیں،

۱۔ بزرگ کی زیارت

۲۔ چائے کی خواہش

۳۔ چائے کے لئے پیسے دینا

۴۔ ادب واحترام سے آپ کا پیشکش کرنا

۵۔ آپ کی جانب سے چائے کی پیشکش میں اسپیس یعنی الوژن زیادہ ہے۔

۶۔ خود کو نامناسب لباس میں دیکھنا، شرمندہ ہونا اور پھر اس ماحول کو قبول کرلینا کہ سب ایسا ہی کرتے ہیں۔

۷۔ چائے کا خیال آنا، کچن کی طرف بڑھنا اور چائے نہ بنانا یعنی بزرگ مہمان کی تواضع میں تاخیر ہونا اور خواب ختم ہو جانا۔

اس عمل کے پیچھے ایک اہم معاملے سے ذہن چوری ہے۔ خواب کے اجزائے ترکیبی پر آپ غور کریں اور تلاش کریں کہ ذہن کو کیا کرنا چاہئے اور ذہن نے کیا کیا ہے۔ یعنی آپ نے الوژن کو اہمیت دی ہے اور بزرگ کی خاطر مدارات میں لاپروائی ہوئی ہے۔

شوہر

ز۔ب، چنیوٹ: صاحبِ یقین بزرگ ہمارے

گھر میں تشریف فرما ہیں۔ ان کا موڈ بہت خوش گوار ہے۔ میرے چھوٹے بیٹے کو نام لے کر بلایا کہ یہ پیسے لو اور فلاں چیز لے آؤ۔

تعبیر: اس خواب کی تعبیر اپنے شوہر سے پوچھئے۔ وہ انشاءاللہ خواب کا تجزیہ کرکے تعبیر بتائیں گے اور تعبیر میں مشورہ شامل ہوگا۔

دانت

م۔ب: دانتوں کی مضبوطی آزمانے کے لئے ہاتھ لگایا یا دانتوں کو بھینچا تو وہ مضبوط اور سلامت ہونے کے باوجود ہلنے اور جھڑنے لگے یہاں تک کہ صرف چند دانت باقی بچے اور وہ بھی اتنے طاقتور نہ تھے کہ چبانے کا کام دیں۔

تعبیر: پانچ وقت مسواک کرنا دانتوں کی صفائی کے لئے مفید ہے۔ بظاہر دانت مضبوط ہیں لیکن خواب میں نشاندہی کی گئی ہے کہ دانتوں کی صفائی کا انتظام نہیں کیا گیا تو خدانخواستہ پائیریا ہوسکتا ہے۔ کھانے کے اوقات میں وقفے کا اضافہ ضروری ہے۔

یاسر رفیق، کراچی: تعبیر: ہر آدمی صلاحیتوں کا مجموعہ ہے۔ آپ کو چاہئے اپنی زندگی کا مطالعہ کریں۔ داتا صاحبؒ کی کتاب کشف المحجوب کو غور سے تین دفعہ پڑھیں اور ذہن میں بالیدگی کی مناسبت سے روحانی علوم پر تفکر کرکے مراقبہ کے ذریعے داتا صاحبؒ سے انشاءاللہ فیض ہوگا۔ صاحبِ خواب نے جو ویرانی دیکھی، وہ اپنے اندر بزرگوں کے فیض سے دوری ہے۔

انجانی مخلوق

مہرین، کراچی: بہن کے ساتھ انجان جگہ گئی۔ راستے میں انجانی مخلوق ملتی ہے جو مجھے تنگ کرتی ہے لیکن میری بہن کو نہیں۔ میں چلنے کی بجائے دوڑنے لگی۔ تھوڑی دیر میں ایک بزرگ کی زیارت ہوئی۔ ان کو دیکھ کر رک گئی اور سلام کیا۔ انہوں نے جواب دیا اور ساتھ ہی کئی لوگ وہاں آگئے۔ اس کے بعد دیکھا کہ حضور قلندر بابا اولیاءؒ کے عرس کی تقریب میں شریک ہوں، منقبت پڑھنے کی کوشش کی مگر پڑھ نہ سکی۔

تعبیر: اندرونی کیفیات کے نقوش خواب میں ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ دنیا طلسم کدہ ہے۔ جب ہم دیکھنے کے عمل پر غور کرتے ہیں تو دیکھنے کی کئی طرزیں ہمارے تجربے میں ظاہر ہوتی ہیں۔

ا۔ پیاس لگتی ہے۔ ہم پیاس اس وقت محسوس کرتے ہیں جب پیاس کا خاکہ یعنی دماغ کے اندر اسکرین پر پانی کا Negative ظاہر ہوتا ہے۔

پیاس کی شدت سے پہلے ہونٹ خشک ہوتے ہیں پھر حلق میں لگتا ہے کہ کانٹے پڑ گئے ہیں۔ پیاس کی شبیہ جب رنگ لاتی ہے تو پانی کا مظاہرہ گلاس یا کٹورے کی شکل میں ہوتا ہے۔ پیاسی جان میں تراوٹ آتی ہے تو اس کو آدمی پانی پینے کا نام دے دیتا ہے۔

۲۔ دیکھنے کے میکانزم کی بھی یہی صورت ہے۔ جب تک شے کا خیال نہ آئے، دماغ کے کیمرے کے لینس پر شے کی تصویر نہ بنے، شے ہونے کے باوجود دیکھنے والے کے لئے عدم موجود ہے۔

زندگی کا ہر روپ دراصل بہروپ ہے۔ اطلاع جب تصویر کی شکل میں نظر آتی ہے تو اس کے رخ متعین ہیں۔ کبھی دماغ کی اسکرین پر خوف، ڈر، ناامیدی، لالچ اور سخاوت کی تصویریں نظر آتی ہیں اور کبھی خواب میں نظر آتا ہے کہ خواب دیکھنے والا فرد دوسرے فرد کا خون پی رہا ہے۔ اس کا تمثل غیبت ہے۔ کوئی دیکھتا ہے کہ اس کا ہاتھ کٹ گیا ہے یا کوئی عضو معطل ہو گیا ہے۔ اس کی تعبیر یہ ہو گی کہ خواب دیکھنے والا شخص ذہن چوری کرتا ہے۔

ماہنامہ قلندر شعور جون 2023ء

آپ کے خواب اور ان کی تعبیر

پورا نام:.................... والدہ صاحبہ کا نام:....................

پورا پتہ:....................

ازدواجی حیثیت:.......... وزن (تقریباً):.......... آنکھوں کا رنگ..........

نیند کیسی آتی ہے:.......... بلڈ پریشر (نارمل/ہائی/لو):.......... تاریخ پیدائش:..........

میٹھا پسند ہے یا نمکین چیزیں زیادہ مرغوب ہیں؟.......... فون نمبر..........

خدانخواستہ دماغی، نفسیاتی مرض اور وہم کے مرض میں مبتلا ہوں تو ضرور لکھیں: ہاں / نہیں

مختصر حالات :....................

....

جب دماغ کی اسکرین پر لاشعور سے شعور میں منتقل ہونے والی حرکات وسکنات اسکرین پر ظاہر ہوتی ہیں تو طرز فکر کے مطابق دو روپ اختیار کرتی ہیں۔

۱۔ بدپرہیزی یا ماحول کی ناپاکی کا منظر ہو تو بیماریاں جنم لیتی ہیں۔

۲۔ جب خواب دیکھنے والا فرد خود کو مطمئن دیکھتا ہے، خوش دیکھتا ہے، ڈر اور خوف کے سائے اس پر نہیں منڈلاتے تو وہ ہر حال میں اللہ کو حاضر وناظر جان کر ایسے اعمال کرتا ہے جو ضمیر کو مطمئن رکھتے ہیں۔

اگر خواب میں دیکھے ہوئے حالات وواقعات میں خلفشار ہے تو ایسے خوابوں کو رویائے کاذبہ کہتے ہیں اور جن خوابوں میں یقین کی روشنی شامل ہوتی ہے، وہ رویائے صادقہ کہلاتے ہیں۔

آپ کا خواب اچھا ہے، بزرگ کی زیارت اور منقبت پڑھنے کے شوق کا مطلب ہے کہ آپ کا ذہن اچھا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو مزید خوشی عطا فرمائے۔ آمین۔

خالق سے ربط

اگر کسی بندے کا اپنے خالق سے ربط نہیں ہے تو دراصل وہ دو (۲) پیروں سے چلنے والا جانور ہے۔ ایک جانور چار پیروں سے چلنے والا ہے، دوسرا دو پیروں سے چلنے والا ہے۔ اُڑنے والا جانور اور تیرنے والا جانور بھی چار پیروں سے چلنے والے جانوروں میں شامل ہے۔ اس لئے کہ وہ پر بھی استعمال کرتا ہے اور پیر بھی۔ نیز اس کے اُڑنے کی صورت وہی ہوتی ہے جو چار پیروں سے چلنے والے جانوروں کی ہوتی ہے۔ حیوانات کی نوعوں میں بے شمار دوسری نوعوں کی طرح ایک نوع آدمی بھی ہے لیکن جب کسی بندہ کا تعلق اللہ تعالیٰ سے قائم ہو جاتا ہے تو وہ جانوروں کے گروہ سے نکل کر انسان بن جاتا ہے اور انسانوں کی فکر وفہم یہ ہوتی ہے کہ وہ برملا پکار اٹھتے ہیں کہ ہمارا جینا، ہمارا مرنا سب اللہ کی طرف سے ہے اور اس کی یقینی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب ہمیں پیدا کیا تھا تو پوچھ کر پیدا نہیں کیا تھا۔ دنیا میں ایک فردِ واحد بھی ایسا نہیں ہے جو اپنی مرضی سے پیدا ہوا ہو یا اپنی مرضی سے ہمیشہ زندہ رہے۔

i

Argument to Agreement

When you are tempted to go into an argumentative mode or are ready to blame others, try the following three-step process.

Start the first step by saying, “I understand your point of view…” or, “I understand where you are coming from…” or, “I understand how you feel…”. This makes the other person feel that their feelings and viewpoints are acknowledged.

As a second step, add your view without offending or defending, “However, I only meant that…” or, “But, I want to let you know how I feel…” or, “What I was meaning to say is…”. This projects equality between you and the person you are speaking to and shows that you respect your own point of view along with theirs.

Now move to the third step. Do not decide for them. Keep this step open-ended so that they can come back to you after reviewing what you have said to them, “I will understand if you still want to…” or, “What do you think of what I’ve just shared?” or, “Would you like to take some time and reconsider your view?”

Here is an example demonstrating the usage of all the above-mentioned steps – “I completely understand your viewpoint and also that you come from a space of care, however, my view is slightly different from yours and I would still like to give my way a chance. I also understand if you cannot support me in this. What would you want to do?”

What we are trying to tell the other person through the three steps is that:

1. Their view matters to you.
2. Your view is important to you too.
3. That you would like to find a mid-path.
4. You understand if they do not want to tag along on your journey.
5. You are giving them space to choose between being with you or walking away.
6. Whatever their choice may be, you will respect that.

Remember, coming to an agreement is not always agreeing to walk together, it is also agreeing to walk in different directions with a lot of goodwill and best wishes for the other.

where she was.

It took a while for her to come to terms with what had just happened. The trauma caused by the sudden fall had led to her mind going blank. Gathering courage, she looked around her. She was dangling from the mountain in the middle of nowhere. The winds smashed her against the snow. Luckily, there were no sharp-edged rocks. Looking up, she saw that she was covered by mist. There was no way anyone could see or find her.

Panic set in and she froze in fear. The unknowns scared her. Instantly, the joy of the climb had converted to regret. Zoya shed tears in remorse for refusing the warnings of her parents. She was gripped by repentance. Her mind slipped into self-blame and loathing. The mountaineer in her had lost the confidence that she could climb back up again. She desperately tried to look for the familiar trail to get back on her feet, but the fresh fall of snow had covered all the tracks she knew. She had no choice but to face an entirely new mountain.

The voice of the *Faqeer* rang in her heart once more, "If the house of the world is dark, love will find a way to make windows."

(Maulana Rumi (RA))

The couplet reminded her of the love she had for the mountain. In the intense moments of fear of survival, she had begun to view the very same mountain as a dreadful creature that could prove fatal for her. She focused on the mountain with love, closed her eyes, and prayed. Taking a long deep breath, she whispered, "I trust you my beloved God for your mercy over me through this. I trust you dear Baba for your guidance through your whispers. I trust you dear mountain to embrace me and lead me to a safe space upon you."

The wind pushed her lightly away from the surface of the mountain. She remembered how as a child, her mother pulled the swing that she sat on backward, and then pushed it with force toward her father who stood with open arms, encouraging her to reach out to touch him. The wind played the role of her mother and the mountain, of her father. She let the wind pull her back and then push her close to the mountain with force. Zoya grabbed onto the surface of the mountain with her ice axe. With her first foot in, she was able to quickly catch up on the upward climb. In no time, she reached closer to the summit. Her friends were frantically calling out to her and looking for her. Seeing her frame emerge through the blizzard, they all cheered in relief.

The moment arrived, and they all let Zoya be the first to step on the peak. Zoya placed her flag of victory and looked around her in astonishment at the grandeur of the mountain range spread out before her. The voice of the *Faqeer* whispered again, "A fall does not break the mountaineer in you, rather, it trains you to be an experienced lead climber, my dearest Peri."

❁ ❁ ❁

young child. The climb leader, though very disciplined, was also friendly. She knew that a climb leader was someone with years of experience in mountain climbing and was well-versed in a variety of skills necessary to lead trips on complex mountain terrains. He recapped the importance of being together, conserving energy, and preparing their bodies and lungs for altitudes. He briefed them on the probable challenges, summarised the safe routes, and took them through the safety measures in the event of falls or avalanches.

Zoya's heart beat fast as she saw her dream manifesting. The climb was divided into five levels and would take eleven rigorous hours to the summit. The trails seemed to be well marked in the beginning as many tourists attempted to climb the first level due to there being no requirement for intense training. The challenges of the terrain grew as they climbed higher. The group of ten had covered the first three levels with ease and took a short coffee break. Zoya looked around and was lost in the splendour of white surrounding her. The wind was gusty and sent shivers down her spine. She clutched onto her coffee mug, hoping to soak in the heat, but it was in vain, the hot mug had turned cold in the freezing weather.

The challenges on the way to the fourth level began to leave the group daunted. Two climbers decided to make their way back to the base camp. It was time to check the oxygen supplies. The climb from there on required them to travel light. The lead climber instructed them to carry only the absolute essentials. Zoya realised that with every level of altitude, she progressed, she had to travel lighter. What was useful at one level, proved detrimental at another. The *Faqeer's* voice came echoed in her heart with a gust of wind, surprising her. He was yet again reciting a couplet by Maulana Rumi (RA), "You do not need to voyage anywhere. Journey within yourself. Enter a mine of rubies and inundate in the grandeur of your light."

"Oh, Baba! But, my heart wants to explore the untouched terrains of the mountain and come back knowing more of me," she replied to the voice coming from the unseen without realising her wish would be granted. Rechecking her climbing gear, she climbed with the team. The winds seemed determined to throw them off balance, but eventually, they all managed to reach the fifth level. They were just an hour away from the summit. Her heart was elated as she realised how close she was to achieving her dream.

Zoya was the last to climb. Some of them were expert mountaineers and easily maneuvered around the ways of the mountain. As it was her first time, her lungs struggled to stand the pressure of the sharp winds. Just when she was about to drive the pick of the axe into the snow of the summit, she lost her foothold and rappelled down about 200 feet from

i

The Mountaineer

The foothills of the snowcapped mountains Zoya grew up around had always called her to explore them. Most often, her dreams were images of her standing on the tallest peak in the mountain range, holding a flag of victory. However, her biggest hurdle was her parents.

Though Zoya's parents were liberal, it was too much for them to accept her desire to be a mountaineer. Their minds constantly went through bouts of fear, imagining their child in dangerous situations and facing fatality. These dreadful thoughts made them feel helpless. They knew, once she was on the mountain, she would be on her own and they could not protect her. Hence, they continued to refuse her requests with a standard reply, "When you turn 21, we will not hold you back, as you will be an adult fit enough to make your own decisions."

Every year, Zoya watched people from all over the world undergo rigorous training for the climb and finally make their way up the mountains. Her heart travelled with them till her eyes could follow them. Once the mountaineers disappeared into the altitude, she returned home with a heavy heart. Everyone in her village knew of her dream and had named her '*Peri*' which meant 'Mountain Dweller'.

Passion makes one do things with extreme grit and sheer perseverance; the time finally came. Her parents knew they could not hold her back, Zoya had turned 21. Taking the blessings of her reluctant parents, she set out to a training centre. Just as she was about to enter the gate, she heard a wise *Faqeer* (Friend of God) nearby recite a poem by Maulana Rumi (RA), "I was a tiny bug, now a mighty mountain. I was once left behind but I am now honoured amongst those in the forefront. You healed my wound of yearning and wrath, and transformed me into a poet who sings about bliss."

She looked in his direction perplexed, not understanding what he meant. The *Faqeer* smiled and said, "Go on my dear Peri! The mountains have waited long to reveal upon you great wisdom." "Thank you, Baba," she replied with great love. She ran over to him to take his blessings. Baba had been her mountain too. She had climbed the paths of passion and love with him all through her childhood. Though her excitement had made her forget to take his blessings, he had not forgotten to come over and bless her.

Days flew by. Zoya was a quick learner and the day finally arrived when she could don her mountaineering gear and finally set foot on the mountains that she had fallen in love with, ever since they had reflected in her eyes as a

ماہنامہ

روحانی ڈائجسٹ
کراچی

یہ پرچہ بندہ کو خدا تک لے جاتا ہے
اور بندہ کو خدا سے ملا دیتا ہے

چیف ایڈیٹر: خواجہ شمس الدّین عظیمی

مینیجنگ ایڈیٹر: ڈاکٹر حکیم وقار یوسف عظیمی

روحانی ڈاک میں آپ کے مسائل و مشکلات کا حل پیش کیا جاتا ہے۔

شعور کے پس پردہ لاشعور کی حقیقت کی پردہ کشائی کی جاتی ہے۔

خواتین کی زندگی کو پُرکشش، پرسکون بنانے کے لئے مضامین شائع کئے جاتے ہیں۔

بچوں کے لئے کہانیاں اور بہترین مستقبل کے لئے راہنما اصول بیان کئے جاتے ہیں۔

دین و دنیا کی خوشی حاصل کرنے کے لئے روحانی ڈائجسٹ ہر جگہ دستیاب ہے۔

write this couplet yourself or was it written by someone else?"

Shah Abdul Rahim (RA) replied, "I have written it."

Before Shah Abdul Rahim (RA) passed from this world, he asked people several times if it was dawn. They kept replying that it was not dawn yet.

When the time of his passing approached, Shah Abdul Rahim (RA) said, "For you, the time of prayer has not come as yet, but, my prayer time is now."

He departed from this world silently, while offering his prayers and reciting God's name.

In his book, *'Anfas-ul-Aarifeen'*, Shah Waliullah (RA) documented his father's life and quotes. This article has been extracted from this book.

Golden Quotes of Shah Abdul Rahim (RA)

- Refrain from talking about a nation's shortcomings and do not deny anyone openly when you are in a public gathering.
- Before submitting your request, begin with an appealing introduction and word it properly and speak slowly. It will not reflect as if you are pelting the person who you are requesting with stones.
- One should wear clothes that reflect one's disposition of excellence.
- It is not recommended to communicate in complicated words when you are in the presence of the elderly.
- It is foolish to adopt a certain style of clothing, habit, or favourite phrases that become an identification as this can get one targeted in the puns and jokes of others.
- Some friends love you sincerely through their hearts because, once your love for them has seeped deep into them, they are unable to free themselves from your love. Yet, some are friends with you because you are either superior to them or catering to their needs in some form. Reconsider the status of every friend; giving everyone equal status in one's life is not wise.

Thought

Every thought has the energy to affect us and others around us. Therefore, we must direct our minds to think toward the collective advantage of everyone around us.

When thoughts become compulsive, they effectively programme our personalities. Is it not wise then in this case, to make *Zikr* (remembrance) our compulsive thought so that our personality and thinking align with God, and we begin to positively impact those around us too?

V

step of royals."

Shah Waliullah (RA), the son of Shah Abdul Rahim (RA), writes,

"During the declining phase of the Mughal Empire, one of Bahadur Shah Zafar's sons wrote a letter to my father, requesting his blessings and making a heartfelt appeal to meet him once. He also wrote to my father that if he came to pay respects to Khwaja Moinuddin Chishti (RA), he could meet him as well, and it would not cause any unease to him. My father replied, 'I cannot be fooled by your words.'"

Once, there was a discussion on eternal presence. A learned person in the gathering said that eternal presence can be attained when a friend of God focuses their attention on being present before the Divine, and they succeed in their efforts immediately and effortlessly.

Shah Abdul Rahim (RA) replied to this, "This state can even be attained by putting in very little effort. The eternal presence is that which never ceases. For instance, the sense of sight never disconnects from the one who sees."

Someone asked, "Which path leads to God?"

Shah Abdul Rahim (RA) replied, "It is written in the Holy Quran that those who have attained the consciousness of God are the ones who do not stop remembering God because of their livelihood and personal interest."

Once, Shah Abdul Rahim (RA) was discussing *Lataif-e-Sitta* (the six subtleties) with his son, Shah Waliullah (RA) when he asked him to go and bring a pen and paper.

When Shah Waliullah (RA) brought the items, Shah Abdul Rahim (RA) drew a circle and said, 'This is *Qalb.*' He then drew another circle within it and said, 'This is *Rooh*.' He drew more circles within the circle till he reached the point of the *Ana* (self). He told Shah Waliullah (RA), "I like this subtlety the most; the rest of them are dimensions." He then equated his words with that of Khwaja Naqshband (RA),

آئینہ مارا شش جہت است

"Our mirror is six-dimensional."

On another occasion, Shah Waliullah (RA) said that he saw a *Doha* (a form of a couplet in Urdu and Hindi literature) in his father's journal written in his handwriting,

جب جیو نہ تھا تب پیو نہ تھا اب پیو ہے جیو ناتھ

رحیمؔ پیاسوں یوں ملے جوں بوند سمندر ناتھ

Translation: When my 'self' was before me, I had no Beloved, but now when I have negated myself completely, I met my Beloved like a drop that embraces the ocean.

Shah Abdul Rahim (RA) rarely shared such things, so Shah Waliullah (RA) asked him, "Did you

chest and face. When he woke up, I described to him what I saw. To this, he replied, 'It was the fruit of my patience.'"

Shah Abdul Rahim (RA) remained content and preferred simple clothing. He said, "Ever since I adopted *Istighna* (complete dependence on God), I have never bought myself clothes, turbans, trousers, or gloves from the market. God makes them available to me in plenty whenever I need them."

Somebody asked him, "God provides you with resources but through the medium of people. This is the same with the masses. So, what is so special about you?"

He replied, "You run after people in your pursuit of living, and establish expectations from them, whereas we remain attentive to God and are fully aware that whatever comes to us, comes from His grace."

The man spoke again, "But, I am still unable to differentiate."

As the man said this, it occurred to him that he should present Shah Abdul Rahim (RA) with something, but Shah Abdul Rahim (RA) refused to accept it. Though the man insisted, Shah Abdul Rahim (RA) did not concede to his requests. Seeing this, the man said, "I will consider myself fortunate if you accept my offering, otherwise, I will have to infer that I am an awful person." To this, Shah Abdul Rahim (RA) instructed him to put the offering on the doorstep.

The man complied with his instruction.

Shortly after, a woman came by begging for resources.

Shah Abdul Rahim (RA) asked her to take the offering with her.

He then turned towards the man and enlightened him, "Now do you understand the difference between how you receive your resources and how we do?"

One of Shah Abdul Rahim's (RA) devotees was a close courtier of the Mughal emperor, Aurangzeb. He once mentioned his spiritual affiliation with Shah Abdul Rahim (RA) to the emperor, to which, Aurangzeb immediately expressed his desire to meet him. Aurangzeb asked the courtier to invite Shah Abdul Rahim (RA) to his palace, to which he was told that the friend of God did not visit emperors and royals. The Mughal emperor insisted nonetheless and sent a personal invite but Shah Abdul Rahim (RA) declined to meet him.

Later on, the devotee through whom the invitation was sent across, requested Shah Abdul Rahim (RA) to write a letter to the emperor as reply, so that the emperor would not feel that the devotee had not conveyed the invitation with proper etiquette. Shah Abdul Rahim (RA) wrote a letter to the emperor on simple paper,

"It is the worst thing for a *Faqir* (Friend of God) to go to the door-

footsteps. He often said, "Whatever I have, is through the blessings of the *Durood* and solitude."

It is written in his *Malfoozat* (published volumes on his biography, speeches, and quotes):

"There was a time when we had nothing to cook for *Niyaz* (offering) for the soul of Prophet Muhammad (PBUH). And so, we roasted some chickpeas and cooked *Qand-e-Siyah* (black jaggery). That night, through my inner eye I witnessed that the Holy Prophet Muhammad (PBUH) was served with a myriad of food platters of all kinds. The roasted chickpeas and *Qand* were also presented to him. He heartily received everything and asked the server to give him the *Qand*. He tasted the food presented to him and then distributed it amongst his companions.

Auliya Allah live by the laws of *Sharia* and *Tareeqat*. They follow it strictly and do not include anyone except God in their prayers and worship.

Once, Shah Abdul Rahim (RA) met a man at Syed Lutf's (RA) home who disagreed with Sufis on some issues. The servant of the house had gone out to purchase groceries and had placed a pot on the stove and left it cooking. It was time for prayers. The man led the prayer but he was perturbed by the thought that the food might burn. Shah Abdul Rahim (RA) became aware of his thoughts and decided to pray separately without being under his lead. The man disapproved of this conduct and demanded the reason.

Shah Abdul Rahim (RA) replied, "During your prayer, your thoughts were running after the servant and the food that was cooking. Tell me, how could I have prayed under your lead?"

The man was severely embarrassed and corrected his actions.

Whenever Shah Abdul Rahim (RA) was offered a gift, he immediately distributed it amongst people. He took particular care to honour the rights of people.

Once a man presented a lump sum to him. Seeing it, Shah Abdul Rahim (RA) said that he saw a certain shadow over it as if it was *Zakat*. The man confirmed that it was indeed, *Zakat*.

God Almighty has detailed the innumerable benefits of patience and has also insisted upon receiving help from establishing prayer and practicing patience. He has stated that He is with those who practice patience.

A devotee, Sheikh Faqirullah, narrated that when Shah Abdul Rahim (RA) did not show his grief despite being aggrieved when his mother passed away; he just went silent. "One night, when he was sleeping and I was massaging his feet, I saw *Noor* (a stage of Divine Light) appearing and engulfing him, especially his

you like to know it?"

Shah Abdul Rahim (RA) responded, "God, through His special grace has saved me from this disease. However, if I come across leprosy patients, I will bring them to you."

Several days passed by, and the man finally revealed that he was testing Shah Abdul Rahim (RA) by posing these questions. He complimented him for his high character.

Indeed, the biographies of *Auliya Allah* (Friends of God) revolve around the theme of guarding and realising their inner light; righteous people live their lives and take decisions under this light.

During his period of training, it occurred to Shah Abdul Rahim (RA) that he should meet a man of *Kashf* (knowledge of revealing hidden matters). He had heard a lot about him, and therefore, decided to get a share of *Kashf* from him. His first thought, however, guided him to not go, but he dismissed the inspiration. The inspiration cautioned him again, but Shah Abdul Rahim (RA) did not relent and made his way to meet the man. As soon as he stood up, he slipped and fractured his foot. There was nothing that could have caused the slip. The place where he stood up was not muddy nor was there any barrier that could have tripped him. Just then, his inner voice spoke in an assertive voice, "Had you heeded the first warning, you would have saved yourself from his fall."

One day, as Shah Abdul Rahim (RA) was performing *Muraqaba* (meditation) at *Asr* (pre-dusk), he was dominated by the experiences of his subconscious. On this incident, he narrates, "At this point, a mere one unit of time was expanded to 40,000 years, and in this stretch of time, I was shown the various states and whereabouts of all creations that were born from the beginning until the end of time."

He narrated one of his experiences related to *Fana Fi Allah* (Annihilation of the self in God):

"One day, I was under the influence of the states of *Fana-e-Kulli* (when one is completely absorbed in the oneness of God such that they forget their existence) and *Ghaibat Nama* (staying completely detached from one's self and God's creations while being fully present before God). I saw that God Almighty ordered the angels to bring a certain person before Him. The angels searched for the person in every nook and cranny of the universe, heavens, earth, and paradise, but failed. Then God stated, "He who is annihilated in Me will never be found on earth, in the heavens, or the paradise."

Shah Abdul Rahim (RA) was exceptionally devoted to the last Prophet, Muhammad (PBUH), and always preferred to follow in his

Eternal Presence

"He who is annihilated in Me will never be found on earth, in the heavens, or the paradise."

When Sheikh Rafiuddin (RA) handed a book on *Tareeqat* (the path of spirituality) to his youngest daughter, before he passed from this world, his wife objected and advised against it as the girl was unmarried. She suggested that their daughter be given a dowry and other relevant household objects instead of books. Sheikh Rafiuddin (RA) said in response, "This book is not ordinary. It has been passed on to me by my Spiritual Guides. Our daughter will birth a son who is the actual heir of this spiritual legacy. I have handed this spiritual inheritance to our grandson, and about the material belongings that you worry about, God is sufficient with His infinite mercy upon her as her sole Provider and Sustainer."

This prediction by Sheikh Rafiuddin (RA) on the arrival of his grandson, was fulfilled by the birth of Shah Abdul Rahim (RA). Shah Abdul Rahim (RA) once narrated an incident that took place before he arrived in this world,

"While I was still in my mother's womb, my mother offered half of her bread to a beggarwoman. Just as she was about to leave, my mother called out to her and gave her the remaining bread too. My mother said that the child in her womb was insisting on her offering all of her bread in the path of God."

Sheikh Abdul Rahim (RA) was spiritually blessed by many eminent personalities belonging to different spiritual orders, and amongst them were Syed Azmatullah Akbar Abadi (RA), Hazrat Abul-Qasim Akbar Abadi (RA), and Khwaja Abdullah, famous as Khwaja Khurd (RA).

When Shah Abdul Rahim (RA) was approximately nine or ten years of age, a spiritual man affiliated with the Naqshbandia Sufi Order arrived from Bukhara and settled in his neighbourhood. This spiritual man paid special attention to Shah Abdul Rahim (RA). One day, he called upon Shah Abdul Rahim (RA) and shared, "I know a *Durood* (salutation on the Last Prophet Muhammad (PBUH)) that, when recited, brings incredible abundance to a person."

Shah Abdul Rahim (RA) replied innocently, "But God fulfills all my needs through my father."

Hearing this, the spiritual man remained silent. A few days passed by and the man framed his question differently, "My elders have taught me few phrases which when recited and blown upon a patient suffering from leprosy, will heal them instantly. Would

images when they are in the form of waves. This is referred to as the senses being present at one point.

• • ——————— • •

Every child enters this world with the inherent ability to observe all the senses as waves. They give prominence to the waves and hence do not distinguish hearing and vision as separate from each other, instead, they know that hearing and seeing are both waves. However, when they are introduced to a limited thinking pattern, they begin to see things as separate from one another. This thinking pattern gives rise to doubts and worries that begin to dominate them, so much so that a veil is drawn upon the consciousness with which they had first arrived into this world. Now, they see the waves divided into colours, and this division makes them see distance between everything.

If the environment of a child has the pattern of realism, that is, the parents follow the teachings of God, His Prophets (PBUT), and the last Prophet, Muhammad (PBUH), engage in invocation, enrich their minds through contemplation, remain in service of people, keep faith in God, remain far from doubts, and desire that their next generations love Prophet Muhammad (PBUH); their children attain an enlightened thinking pattern.

- Mankind cannot be aware of reality unless they are aware of the waves.
- Though there are distances of time and space in the waves, they seem to be non-existent due to speed.
- The sound of our speech collides with the hair inside our ears, and forms an image on the screen of our mind.
- A common person confines themselves to the observations of this image.
- An individual enlightened by *Noor* (a stage of Divine Light) searches for the system of waves in these images.
- During this search, every sign becomes the sign of the destination.

All readers, whether ladies, gentlemen, young or elderly, are requested to send in their comments on the *Message of the Day.*

May God protect you.

ii

ently into space, make gurgling sounds, smile, and also express their pain. Where do they look? What do they see? And why do they smile?

The child is familiar with the subconscious world where patterns of colours exist, however, rather than paying attention to them, their mind is focused on the light. As a result, the senses that observe reality are activated in them, overpowering the senses in which there is illusion.

Until the age of three months, a child recognises their mother through her fragrance. These fragrances travel through waves, indicating that a child is unaware of the distinct senses of hearing, seeing, and speaking that is in them. Instead, they see through the inner eye which observes all senses unified at a single point, and this point of unity is represented by the waves. An infant identifies, sees, and hears through these waves. They are aware that they hear, speak, smell, and feel when an image forms within them. They also know that they see through their subconscious mind. However, the influence of the fictitious environment, makes them gradually forget this innate awareness.

Experience the following: When one utters, "Water," the image of water appears inside them. Likewise, when a child feels the absence of its mother, it cries and expresses its annoyance. The feelings of remembrance generate an image of the mother on the screen of their mind. As soon as the mother comes and holds the child close to her bosom, it becomes happy.

• • ——————— • •

One can easily comprehend how the senses can be distinct from one another and also exist unified at one point, through the example of smartphone. When one makes a video call to someone who is perhaps a few kilometres or thousands of miles away, how does the voice come from the speaker, and from where does the image appear on the screen? The waves that arrive through the mobile tower have both sound and images in them; once these waves enter the smartphone, they become audible and visible. What we see and hear are forms of waves. When these waves divide and appear as sound and images, it is called, the division of senses. This division makes one feel that the sound and images are different from each other, while they are not. The distinction occurs only when the waves enter the smart phone; one does not differentiate between the sound and

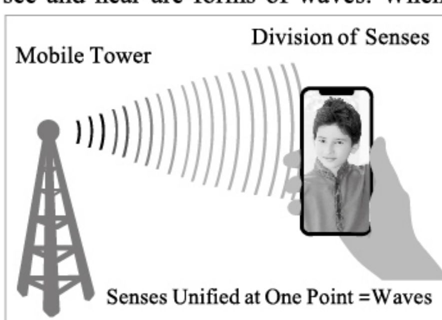

Message of the Day

When a child arrives into this world, they hold the awareness of who they are and also of the One Who created them. Though this world is new to them, it is not the first world they have arrived into. Before their arrival into this world, they have traversed through numerous worlds where they were aware of the reality that they are creatures and God is the Creator.

This consciousness was instilled on the day when God introduced Himself to all of creation and asked them, "Am I not your Lord?" God's voice awakened the senses within the creation and activated their ability to recognise. Through this ability, the creatures first became aware of their sense of hearing, and then sought the source of the voice and the identity of the One Who had called out to them, and this activated their sight. As soon as their observation entered their perception, they attained unwavering faith that 'The Being' Who called out to them was the Lord of all realms. The creatures submitted by declaring, "Indeed! You are our Lord," and prostrated in reverence.

All the worlds that are present in this universe are in fact, gradations of colours and lights. These lights appear in the form of various colours and colours imply distance. When one observes light in a world where the gravitational force is subdued, one does not think of colours, however, contrary to this, in a world that is dominated by gravitational force, because the colours are dense, despite the existence of light, one does not think of light while observing it. This can be illustrated for easy understanding through the example of water. Water is a specie and has its own family. Water can be sweet, salty, or hard. It is also found in various colours such as blue, green, red, and black. Water can be hot or cold; muddy or crystal-clear too. While crystal-clear water acts as a mirror and takes one's sight all the way to the bottom, the murky water, despite absorbing the reflection, does not show the image that is inside it, and its surface becomes a veil to the eyes. We could equate murky water to dense colours.

• • ———————— • •

The mind of a new-born child is free from the traditions and norms of the new world, yet, they are not ignorant of the universal consciousness. For three months after their birth, the child's thinking pattern is influenced by the worlds that they have arrived from. Infants gaze consist-

Contents

Message of the Day	K. S. Azeemi	138
Eternal Presence	Quratulain Wasti	135
The Mountaineer	Bibi Anuradha (UAE)	128
Argument to Agreement	Shahzad Amir	125

"Until one is completely absorbed in the essence of what they see, they do not see it."

Vol11 Issue5 | June 2023 | Dhul Qadah Dhul Hijjah – 1444AH

بسم الله الرحمن الرحيم

Monthly Karachi

Qalandar Shaoor

Neutral Thinking

(Urdu — English)

Patron in Chief

Huzoor Qalandar Baba Auliya[RA]

Chief Editor

Khwaja Shamsuddin Azeemi

Editor

Hakeem Salam Arif

Circulation Manager

Muhammad Ayaz

Furnished by Azeemi University Press. Shah Alam Azeemi, the Publisher has published it at Ibn-e-Hasan Offset Printing Press, Hockey Stadium, Karachi and disseminated at Surjani Town Karachi.

Rs.130/- Per issue. Annual subscription Rs.1944/- with Reg. Post (Domestic), US$ 75/- (International)

Contact: B-54, Azeemi Mohalla, Sector 4-C, Surjani Town Karachi, Pakistan. Ph: +92 (0)213 6912020

NEST ESTATE ADVISOR
& Construction Management

پنجاب (پاکستان) اور جنوبی امریکہ میں کمرشل،
رہائشی اور منظور شدہ سوسائیٹیز سے متعلق معلومات اور
لین دین کے لئے ہم سے رابطہ کریں۔

Muhammad Kamran Riaz

For Details, Contact : +92 334 4980 350

SANGAM HOTEL MUZAFFARABAD

HOSPITALITY IS OUR TRADITION

We serve famous delicious Cuisines, offer Air conditioned Rooms, Suites, well equipped Wedding and Conference hall and great Customer service.

Phone No: +925822444194-5 Fax No: +925822442587

Email:sangamhotel@hotmail.com

- Domestic/Commercial Independent solar systems
- Solar Powered Street Lights
- Solar Tube well pumps
- Hybrid solution for Telecom sector/BTS towers
- Large Scale Photo Voltaic plants

SOLAR SOLUTIONS

CCTV

COMMERCIAL

RESIDENTIAL

SAMSUNG alhua TECHNOLOGY

We offer best IT solutions to meet your needs!

Cummins

Power Generation

DIESEL GENERATORS

GUIDELIGHT
BUSINESS SOLUTIONS

We Offer Sustainable Solutions...

Jawad Tower, Block-B, 4th Floor, Flat # 6, University Road, Peshawar-Pakistan.**Ph#** 091-5711454
E-mail: info@gbs.com.pk , azeemi.moon@gmail .com **web:** www.gbs.com.pk

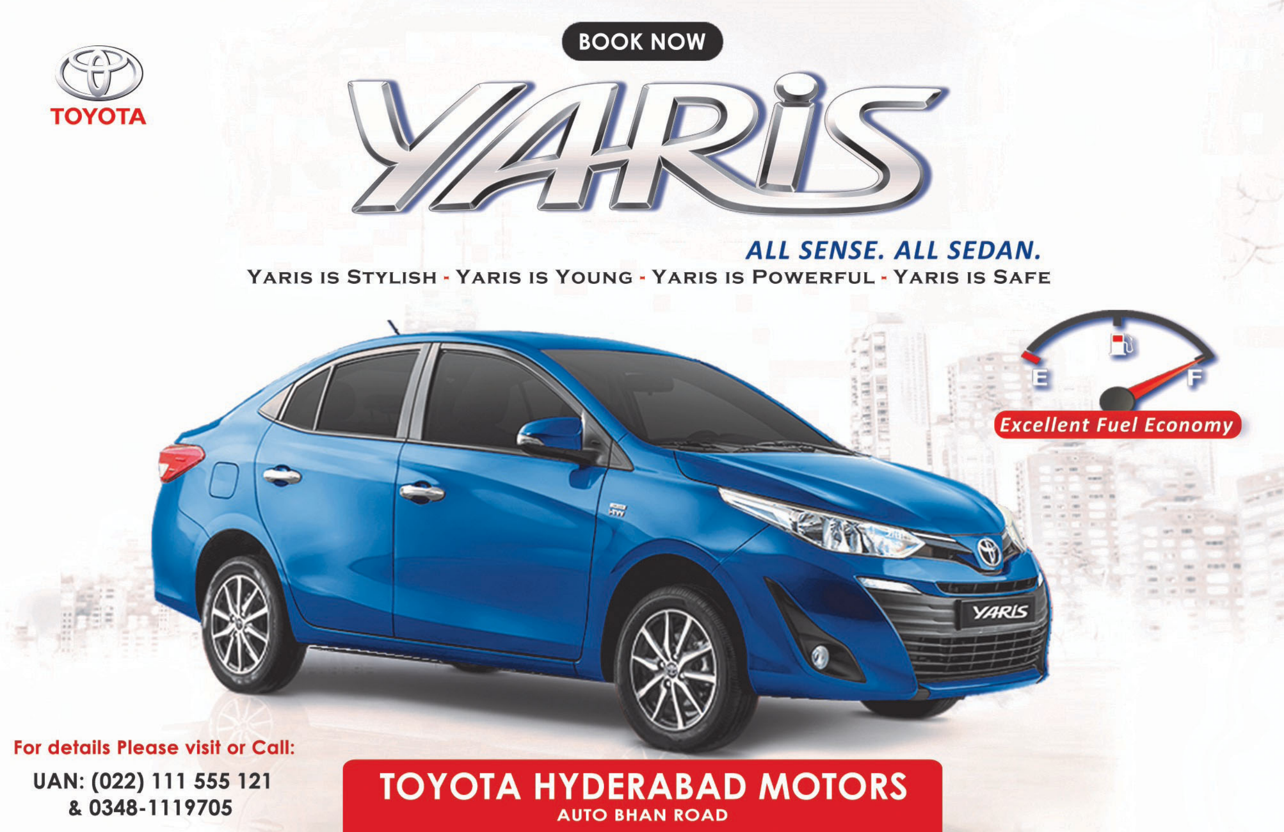
TOYOTA
BOOK NOW
YARIS
ALL SENSE. ALL SEDAN.
YARIS IS STYLISH - YARIS IS YOUNG - YARIS IS POWERFUL - YARIS IS SAFE
E
F
Excellent Fuel Economy
YARIS
For details Please visit or Call:
UAN: (022) 111 555 121
& 0348-1119705
TOYOTA HYDERABAD MOTORS
AUTO BHAN ROAD